اسلامیات

لازمی

گیارھویں جماعت

FREE FROM GOVERNMENT
NOT FOR SALE

KHYBER PAKHTNKHWA TEXT BOOK BOARD

اسلامیات

لازمی

گیارھویں جماعت

خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور

رشوت دینے اور لینے والے پر
اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

(ابن ماجہ)

جملہ حقوق بحق خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور محفوظ ہیں۔

تیار کردہ: خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور

صوبہ خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقہ جات کے لیے بطور واحد لازمی کتاب برائے انٹرمیڈیٹ کلاسز۔

نظر ثانی و منظور کردہ: وفاقی وزرات تعلیمات حکومت پاکستان اسلام آباد

تدوین:

ڈاکٹر ساجد الرحمن اورکزئی، ماہر مضمون (اسلامیات)

خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور

زیر سرپرستی:

گوہر علی خان، ناظم نظامت نصاب و تعلیم اساتذہ خیبر پختونخوا، ایبٹ آباد

دوبارہ نظر ثانی:

★ ڈاکٹر مفتی عبدالوہاب، پروفیسر / وائس پرنسپل گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج نمبر 1، ایبٹ آباد

★ قاری عبدالشکور، سینئر معلم اسلامیات، گورنمنٹ ہائی سکول جھنگی ایبٹ آباد

★ اعزازاللہ، ماہر مضمون (اسلامیات)، خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور

★ ہدایت اللہ، ایڈیشنل ڈائریکٹر، نظامت نصاب و تعلیم اساتذہ خیبر پختونخوا، ایبٹ آباد

طباعت زیر نگرانی:

عصمت اللہ خان گنڈاپور، چیئرمین

سعید الرحمن، ممبر (ای اینڈ پی)،

خیبر پختونخواہ ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور

تعلیمی سال: 2020-21

ویب سائٹ: www.kptbb.gov.pk

ای میل: membertbb@yahoo.com

فون نمبر: 091-9217159-60

فہرست

باب نمبر	عنوان	صفحہ
	اسلام کا تعارف	۱
باب اوّل	بنیادی عقائد	3
	توحید	3
	وجود باری تعالیٰ	4
	توحید ذات و صفات	7
	شرک	9
	۱۔ ذات میں شرک	10
	۲۔ صفات میں شرک	10
	صفات کے تقاضوں میں شرک	10
	انسانی زندگی پر عقیدہ توحید کے اثرات	12
	۱۔ خودداری	12
	۲۔ انکسار	15
	۳۔ وسعت نظر	13
	۴۔ استقامت و بہادری	13
	۵۔ رجائیت اور اطمینان قلب	14
	۶۔ پرہیزگاری	14
	۷۔ توکل علی اللہ	15
	رسالت	15
	وحی	16
	رسول کی ضرورت	17

باب نمبر	عنوان	صفحہ
	انبیاء کی خصوصیات	
	۱۔ بشریت	18
	۲۔ امین	19
	۳۔ تبلیغ احکام الٰہی	19
	۴۔ معصومیت	19
	۵۔ واجب اطاعت	20
	رسالت محمدؐ اور اس کی خصوصیات	
	۱۔ عمومیت	20
	۲۔ پہلی شریعتوں کا نسخ	21
	۳۔ کاملیت	21
	۴۔ حفاظت کتاب	21
	۵۔ سنت نبویؐ کی حفاظت	22
	۶۔ جامعیت	
	۷۔ ہمہ گیری	
	۸۔ ختم نبوت	23
	۹۔ ناموس رسالت	۲۵
	ملائکہ پر ایمان	۲۶
	آسمانی کتابیں	۲۸
	آخری آسمانی کتاب	۲۹
	۱۔ محفوظ ہونا	۲۹
	۲۔ قرآن کی زندہ زبان	۳۰

باب نمبر	عنوان	صفحہ
	۳-عالمگیر کتاب	۳۰
	۴-جامع کتاب	۳۱
	۵-عقل وتہذیب کی تائید کرنے والی کتاب	۳۱
	۶- قرآن مجید کا اعجاز	31
	آخرت	
	مفہوم	32
	منکرین آخرت کے شبہات اور ان کا قرآنی جواب	33
	اسلام میں عقیدہ آخرت کی اہمیت	35
	۱-نیکی سے رغبت اور بدی سے نفرت	36
	۲-بہادری اور سرفروشی	36
	۳-صبر وتحمل	37
	۴-مال خرچ کرنے کا جذبہ	37
	۵-احساس ذمہ داری	37
	۶-سوالات	37
باب دوم		
	اسلامی تشخص	
	ارکان اسلام	39
	کلمہ شہادت	39
	انسانی عظمت کا ضامن عقیدہ	41
	نماز کی تاکید	42

باب نمبر	عنوان	صفحہ
	نماز کے فوائد	43
	بے روح نمازیں	45
	روزہ	45
	ضبط نفس	46
	روزوں کا ثواب	47
	روزے کے اجتماعی فوائد	48
	رمضان المبارک اور قرآن حکیم	49
	رمضان اور پاکستان	49
	بے اثر روزے	49
	زکوٰۃ	50
	معاشی فوائد	51
	معاشرتی فوائد	52
	زکوٰۃ کے مصارف	53
	مسائل زکوٰۃ	54
	ادائیگی زکوٰۃ کے چند اُصول	54
	حج	37
	جامعیت	57
	زائرین خانہ کعبہ کی کیفیات	58
	فوائد	59
	حج مقبول	60
	جہاد	61
	جہاد کا مفہوم	61

باب نمبر	عنوان	صفحہ
	اقسام جہاد	61
	خواہش نفس کے خلاف جہاد	61
	جہاد بالسیف	63
	جہاد اور جنگ میں فرق	64
	جہاد کے فضائل	65
	اللہ تعالیٰ اور رسول اللہؐ کی محبت اور اطاعت	
	اللہ تعالیٰ کے احسانات	66
	رسول اللہ کے احسانات	66
	شرط محبت، اطاعت رسولؐ	67
	حقوق العباد	
	والدین کے حقوق	69
	اولاد کے حقوق	70
	میاں بیوی کے باہمی حقوق	72
	رشتہ داروں کے حقوق	74
	اساتذہ کے حقوق	75
	ہمسایوں کے حقوق	76
	غیر مسلموں کے حقوق	78
	معاشرتی ذمہ داریاں	79
	دیانتداری	79
	ایفائے عہد	80
	سچائی	82
	عدل وانصاف	82

باب نمبر	عنوان	صفحہ
	احترام قانون	84
	کسب حلال	85
	ایثار	86
	اخلاقی رذائل	88
	جھوٹ	88
	غیبت	89
	غیبت واتہام کا فرق	
	منافقت	91
	تکبر	92
	حسد	93
	سوالات	94
باب سوم		96
	رحمت للعالمین	96
	امت پر شفقت ورحمت	97
	کافروں پر رحمت	98
	عورتوں کے لئے رحمت	98
	بچوں کے لئے رحمت	99
	یتیموں اور غلاموں کے لئے رحمت	99
	اخوت	100
	مساوات	101
	صبر واستقلال	102
	عفو ودرگزر	104

باب نمبر	عنوان	صفحہ
	ذکر	106
	سوالات	107
باب چہارم		
	تعارف قرآن وحدیث	
	تعارف	108
	قرآن مجید کے اسماء	108
	فضائل قرآن مجید	109
	وحی کیا ہے؟	110
	نزولِ قرآن	110
	مکی اور مدنی سورتیں	
	مکی اور مدنی سورتوں کا فرق	112
	حفاظت و تدوین قرآن مجید	113
	صدری حفاظت (سینوں کے ذریعے)	114
	کتابی حفاظت	115
	جمع قرآن حضرت عثمانؓ کے عہد میں	118
	قرآن مجید کی خوبیاں	119
	قرآن مجید کی تاثیر	121
	حدیث اور سنت	123
	حدیث یا سنت کی شرعی حیثیت	124
	تدوین حدیث	127
	منتخب آیات	131
	منتخب احادیث	135
	سوالات	137

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام کا تعارف

اسلام کے لفظی معنی ہیں حکم ماننا، کسی کے سامنے گردن جھکا دینا اور اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دینا۔ شریعت میں انبیائے کرام کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کے احکام ماننے، اس کے سامنے گردن جھکانے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کرنے کا نام اسلام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ایک خاص نظم وضبط کا پابند پیدا کیا ہے۔ زمین ایک مقررہ وقت میں سورج کے گرد اپنا چکر پورا کرتی ہے۔ دن اور رات ایک خاص پابندی کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ سورج اور چاند مقررہ وقت پر طلوع وغروب ہوتے ہیں۔ موسم مقررہ انداز میں بدلتے رہتے ہیں اور کائنات کی کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ احکامِ الٰہی کی پابندی ان کی فطرت میں شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات سے ممتاز پیدا کیا ہے۔ اسے عقل وفکر کی نعمت دے کر ایک محدود دائرے میں اختیار بھی دیا ہے۔ اگرچہ اسے اپنی موت و حیات پر کوئی اختیار نہیں، لیکن اس عرصہ حیات کے مختصر وقفے میں وہ جو کچھ کرتا ہے، اپنے ارادے اور اختیار سے کرتا ہے۔ "اسلام" چاہتا ہے کہ انسان اپنے فکر و عمل کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کا تابع کر دے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ: 3)

ترجمہ: "آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کیا۔"

دین اسلام ایمان اور عملِ صالح کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، رسالت

اور آخرت وغیرہ کا زبان سے اقرار اور ان پر دل سے یقین ایمان کہلاتا ہے اور اسلام کی رو سے ایمان کی بُنیاد پر اللہ تعالیٰ کے احکام بجالانے کو عملِ صالح کہتے ہیں۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

1۔ عبادات :۔ عبادات اللہ کے حضور انتہائی، عاجزی اور محتاجی کے اظہار کا نام ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں نماز، روزہ، زکواۃ، حج جیسے احکام کی بجا آوری کو عبادات کہتے ہیں۔

2۔ معاملات :۔ ان کا تعلق معاشرتی حقوق و فرائض سے ہے۔

3۔ اخلاق :۔ انسانی سیرت کی وہ خوبیاں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور انسان کی شخصیت نکھا۔تی ہیں۔

اعمال کی یہ تقسیم صرف سمجھنے کے لیے ہے۔ ورنہ دین کو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کے ٹکڑے کر کے ایک دوسرے سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ آدمی ایمان تو لائے لیکن احکامِ الٰہی پر عمل نہ کرے۔ یا نیک کام تو کرے لیکن اللہ اور اس کے رُسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لائے۔ ایسا ایمان اور عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں۔ جو نیک کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے نہ کیا جائے اس سے اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوتا۔ اور اس سے دُنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص صرف عبادات میں مصروف رہے لیکن اس کے معاملات احکامِ الٰہی کے مُطابق نہ ہوں تو اس کو ہم باعمل مسلمان نہیں کہہ سکتے۔ نہ کوئی بداخلاق آدمی اچھا مسلمان کہلا سکتا ہے۔ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کے متعلق رُسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قول و عمل سے اللہ تعالیٰ کے احکام ہم تک نہ پہنچائے ہوں۔ ان احکام کو ہر پہلو سے ماننا لازم ہے۔

باب اوّل

بنیادی عقائد

اعمال کی بُنیاد ایمان پر ہے۔ ایمان اس پختہ عقیدے کو کہتے ہیں جو دل کی گہرائیوں میں اتر جائے اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ ایسا عقیدہ روح میں رچ بس جاتا ہے اور دل و دماغ پہ حاوی ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی بات اس کے خلاف نہیں سوچی جا سکتی اور کوئی عمل اس کے خلاف نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ تمام اعمال اس کی وجہ سے اور اس کے اشارے پر کیے جاتے ہیں۔ اس لیے رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب دین اسلام پھیلانے کا حکم ملا تو آپؐ نے عقائد کی اصلاح سے ابتدا فرمائی۔

اسلام کے بنیادی عقائد یہ ہیں:

1۔ اللہ پہ ایمان۔
2۔ ملائکہ پہ امان۔
3۔ آسمانی کتابوں پر ایمان۔
4۔ رسالت پر ایمان۔
5۔ آخرت پر ایمان۔
6۔ تقدیر پہ ایمان۔
7۔ موت کے بعد زندگی پر ایمان۔

تو حید

بُنیادی عقائد میں سب سے پہلا عقیدہ توحید کا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں"۔ توحید کے لغوی معنی ہیں ایک ماننا، یکتا جاننا دین کی اصطلاح میں اس سے مراد ہے، اس دُنیا کے پیدا کرنے والے اور اس کے پرو، دگار کو ایک ماننا، بے مثال ماننا اور صرف اسی

کو عبادت کے لائق سمجھا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اللہ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک جتنے بھی پیغمبران کرام دُنیا میں تشریف لائے ہیں، سب نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی ہے اور انہیں بتایا ہے کہ یہ دُنیا اور اس دُنیا کی تمام چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں اور اسی کے حکم سے یہ سب کچھ ختم ہوگا۔ وہ ایک ہے، اس جیسا کوئی نہیں، صرف اسی کی عبادت کرنی چاہیے اور اسی کا حکم ماننا ضروری ہے۔

وجودِ باری تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے میں کوئی عاقل اور سمجھ دار شک نہیں کرسکتا۔ عقل کا یہی تقاضا ہے۔ ہم کوئی بھی چیز جب دیکھتے ہیں تو یہ یقین ہوجاتا ہے کہ اس کا بنانے والا بھی ہے۔ یہ جو مکان نظر آتا ہے کسی معمار کا بنایا ہوا ہے۔ یہ جو گھڑی چل رہی ہے کسی کارخانے میں بنی ہے اور اس کارخانے کو کوئی چلا رہا ہے۔ کوئی مکان خود بخود نہیں بنتا۔ کوئی گھڑی خود بخود نہیں بنتی۔ کوئی کارخانہ خود بخود نہیں چلتا۔ پھر دُنیا کا یہ عظیم الشان کارخانہ جو نامعلوم وقت سے اب تک ایک خاص نظام کے تحت چل رہا ہے۔ خود بخود کیسے پیدا ہوسکتا ہے اور کیسے چل سکتا ہے؟ زمین ایک خاص وقت میں سُورج کے گرد اپنا چکر پُورا کرتی ہے۔ آج تک اس میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں پڑا۔ ستارے اپنے وقت پر ابھر آتے ہیں اور اپنے وقت پر نظروں سے غائب ہوجاتے ہیں۔ کبھی وہ اپنی رفتار نہیں بھولتے۔

مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ۝

(سورہ الملک: 3،4)

ترجمہ: "تو اللہ کی صنعت میں کوئی فتور نہیں دیکھے گا۔ پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے۔ کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے؟"

سُورج اپنے مدار میں چکر لگا رہا ہے اور چاند اپنے مدار میں۔ نہ سُورج اپنے مدار سے ہٹتا ہے، نہ چاند سُورج کی طرف کھنچ کر جاتا ہے۔ نہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رات آتے آتے رک جائے اور نہ کبھی یہ کہ دن جاتے جاتے رہ جائے۔ قرآن مجید نے اس کی حقیقت کی

طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِؕ وَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (سورہ یٰسٓ: 40)

ترجمہ: نہ سُورج کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے۔ اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔

قدرت کا یہ کارخانہ اسی نظم وضبط کے ساتھ ایک نامعلوم مدت سے مسلسل چل رہا ہے۔ کیا عقل یہ مانتی ہے کہ اتنا بڑا نظام اتنی مدت سے مسلسل بغیر کسی چلانے والے کے چل سکتا ہے؟ ظاہر ہے عقل یہ بات نہیں مان سکتی۔ اس لیے خود یہ کائنات دن رات، چاند سُورج اور زمین و آسمان کا یہ نظم وضبط اللہ کے وجود کا بیّن ثبوت ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۝

(سورہ آل عمران: 164)

ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے بدلتے رہنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو خود اس کی اپنی پیدائش کی طرف متوجہ کیا ہے کہ سوچو اور اگر یہ بات سمجھ میں آجائے تو پھر اس پر یقین کرلو۔ شک وشبہ میں مت پڑو۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَؕ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَۚ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ۝

(سورہ الطور: 35،36)

ترجمہ: "کیا یہ لوگ (انسان) بغیر کسی کے (پیدا کیے) پیدا ہوگئے ہیں یا یہ کہ خود (اپنے) خالق ہیں۔ یا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرلیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے۔"

نظامِ کائنات کی یہ گواہی ایک عقلی دلیل ہے۔ اس دلیل کے بغیر بھی اللہ کو ماننا انسانی فطرت کی آواز ہے اور انسان کی روح کو ایک خالقِ کائنات کے ماننے اور اس

کی عبادت کے بغیر سکون نہیں ملتا۔ اس لیے انسانیت کے ہر دور میں مُہذّب سے مُہذّب اور وحشی سے وحشی قوموں نے کسی نہ کسی صورت میں ایک عظیم ذات کا اِعتراف کیا ہے اور اس کی عبادت کی ہے۔ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ دُنیا کے مُختلف گوشوں میں بسنے والی وحشی اَقوام جن کی فکری سطح بہت کم تھی وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں اللہ تعالیٰ کے وُجود کی قائل تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وُجودِ باری تعالیٰ پر ایمان لانا انسان کی فطرت میں ہے۔ بڑے سے بڑا کافر بھی کسی بڑی مصیبت میں پھنس کر بے اختیار اپنے بنانے والے کو پکار اُٹھتا ہے۔

قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْکُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ○ قُلِ اللّٰهُ یُنَجِّیْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ○

(سورہ انعام: 63،64)

ترجمہ: آپ کہیے وہ کون ہے جو تم کو نجات دے دیتا ہے، خشکی اور تری کے اندھیروں سے۔ کہ تم اس کو پکارتے ہو آہ و زاری کرتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو ہم شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے۔ کہہ دیجیے اللہ ہی تم کو ان (مصیبتوں) سے نجات دیتا ہے اور ہر غم سے پھر تم شرک کرنے لگتے ہو۔

یہ پکار انسان کی اصلی فطرت ہے اور یہ فطرت اللہ تعالیٰ کی موجودگی کی سب سے بڑی گواہ ہے۔

جس طرح یہ بات واضح اور یقینی ہے کہ اس کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا اور چلانے والا ہے اور وہ اللہ ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی واضح اور یقینی ہے کہ وہ اللہ ایک ہے۔ انسانی عقل خود اپنی سوچ میں اسی نتیجے پر پہنچتی ہے۔ اگر ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو ہر ایک اس دُنیا کو اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق چلانے کی کوشش کرتا۔ ایک کشمکش شروع ہو جاتی اور اس کھینچا تانی میں دنیا کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

لَوْ كَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (سورہ انبیاء 22)

ترجمہ: اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے علاوہ اور معبود ہوتے تو ان دونوں (زمین و آسمان) میں فساد برپا ہو جاتا۔

توحیدِ ذات وصفات

اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور اس کارخانۂ قدرت کو چلانے والا موجود ہے اور ایک ہے۔ اس حد تک تو بات واضح ہے اور انسانی عقل نے اس کو ہمیشہ مانا ہے۔ مگر وہ پیدا کرنے والا کیسا ہے؟ اس کے اَوصاف کیا ہیں؟ یہ ایسی باتیں ہیں جو آسانی سے خود بخود سمجھ میں نہیں آتیں۔ اِن باتوں کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر بھیجے ہیں اور ان کے ذریعے اپنے بندوں کو اپنے متعلق بتایا ہے۔

قرآن مجید نے ذات باری تعالیٰ کے متعلق وہ تمام باتیں صاف صاف بتائی ہیں جن پر ایمان لانا فرض ہے۔ اللہ جو تمام کائنات کا پیدا کرنے والا ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ دُنیا نہیں تھی تو اللہ تھا۔ یہ دُنیا نہیں ہوگی تو بھی اللہ ہوگا۔ اُس کی نہ ابتدا ہے، نہ اِنتہا۔ یہ دُنیا اُس نے پیدا کی ہے اور وُہی اِس کی نگہداشت کر رہا ہے۔ جب یہ دُنیا ختم ہو جائے گی اور قیامت آجائے گی تب بھی وہ ہوگا۔ اور انسانوں کو جزا و سزا دے گا۔

كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ (سورہ القصص: 88)

ترجمہ: ہر ایک چیز، اُس کی ذات کے سوا، فنا ہونے والی ہے۔

وہ اللہ اپنی ذات میں ایک ہے۔ نہ اس کا کوئی باپ ہے جس سے وہ پیدا ہوا ہو نہ اس کے بچے ہیں جو اس سے پیدا ہوئے ہوں اور نہ اس جیسا کوئی اور ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ ○ لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ○ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○

(الاخلاص)

ترجمہ: آپ کہہ دیجیے اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر ہے۔

سوچا جائے تو یہ سب باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ جس نے دُنیا کی ہر چیز پیدا کی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر چیز سے پہلے موجود تھا اور جب اس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے وہ ان کو جب چاہے فنا بھی کرسکتا ہے۔ ظاہر ہے اس کا کوئی باپ نہیں ہے ورنہ وہی خدا ہوتا۔ اس کے بچے بھی نہیں ہیں ورنہ وہ ضرور خدائی میں شریک ہوتے اور اس طرح ایک خدا کا تصور ختم ہوجاتا۔

اس بے مثال ذات نے اپنا ذاتی نام اللہ رکھا ہے۔ یہ نام کسی اور کے لیے اِستعمال نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ اللہ کے بہت سے صفاتی نام ہیں جن سے ہمیں اللہ کو پکارنے کا حکم ہے جیسے قرآن پاک میں ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ص (سورہ الاعراف: 180)

ترجمہ: اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں۔ سو ان ناموں سے اللہ ہی کو پکارا کرو۔

اس بے مثال اور یکتا ذات اور ان بے مثال اور یکتا صفات کے تقاضے بھی یکتا ہیں۔ جب وہ ہمارا مالک ہے اور اس جیسا مالک کوئی نہیں۔ وہ ہمارا پروردگار ہے اور اس جیسا پروردگار کوئی نہیں۔ تو پھر وہی عبادت کے لائق ہے۔ عبادت کے لائق اور کوئی نہیں اور اسی کا حکم ماننا چاہیے کسی اور کو حکم دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اسی سے مدد مانگنی چاہیے اور اسی سے ہدایت طلب کرنی چاہیے۔ اس لیے ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں قرآن مجید کی یہ سورت دہراتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۭ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۭ۝ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ ۝ۧ

(الفاتحہ)

ترجمہ: سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ جو ساری مخلوقات کا پالنے والا ہے۔ بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ مالک ہے روزِ جزا کا۔ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ دکھادے ہم

کو سیدھا راستہ۔ راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا ہے۔ نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو گمراہ ہیں۔

شِرک

عقیدۂ توحید انسان کا سب سے پہلا عقیدہ ہے۔ شِرک اور اس کی تمام اقسام بعد کی پیداوار ہیں۔ دُنیا کا پہلا انسان عقیدۂ توحید ہی کا قائل تھا۔ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ جو اللہ تعالیٰ کے پہلے نبی تھے۔ آپؑ نے اپنی اولاد کو بھی توحید کے عقیدے کی تعلیم دی مگر جیسے جیسے انسانی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا اور لوگ اِدھر اُدھر بکھرنے لگے تو آہستہ آہستہ لوگوں نے سچی تعلیمات کو بُھلا دیا اور گمراہی کا شکار ہوکر ایک اللہ کی بجائے کئی خدا ماننے لگے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ انھیں بھی معبود بنا لیا۔ ان لوگوں نے جس چیز کو ہیبت ناک دیکھا، اس سے ایسے خوفزدہ ہوگئے کہ اسے دیوتا سمجھ لیا اور اس کی پوجا پاٹ شروع کردی۔ اس طرح انھوں نے آگ کا دیوتا، سمندر کا دیوتا اور آندھیوں وغیرہ کے دیوتا گھڑ لیے۔ دوسری طرف جن چیزوں کو بہت نفع بخش پایا، ان کی بھی پوجا شروع کردی۔ گائے وغیرہ کی پوجا اسی وجہ سے شروع ہوئی۔ ان لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے کئی پیغمبر بھیجے جنھوں نے ان کو توحید کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور شرک کی مَذمّت کی۔ قرآن مجید میں شِرک کو بہت بڑا ظُلم کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (سورۃ لقمان: 13)

ترجمہ: بے شک شِرک بہت بڑا ظُلم ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ

(سورۃ النسآء: 48)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ (یہ بات) معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے۔ لیکن اس کے علاوہ (اَور گناہ) جس کسی کو بھی چاہے گا بخش دے گا۔

شرک کے لُغوی معنی "حصہ داری" اور ساجھے پن کے ہیں۔ دین کی اِصطلاح میں شرک کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات کے تقاضوں میں کسی کو اس کا حصہ دار اور ساجھی ٹھہرایا جائے اس طرح شرک کی تین اقسام ہیں :-

1- ذات میں شرک

اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر اور اس کے برابر سمجھا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کی اَولاد یا کسی کو اللہ تعالیٰ کی اَولاد سمجھا جائے کیونکہ والِد اور اَولاد کی حقیقت ایک ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا جس طرح دو خداؤں یا تین خداؤں کو ماننا شرک ہے اسی طرح کسی کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا یا بیٹی سمجھنا بھی شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝ (سورۃ اخلاص: 4،3)

ترجمہ :- نہ اس سے کوئی اَولاد ہے، نہ وہ کسی کی اَولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔

2- صِفات میں شرک

اِس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسی صِفات کسی دوسرے میں ماننا، اور اُس جیسا علم، قدرت یا اِرادہ کسی دوسرے کے لیے ثابت کرنا، کسی دوسرے کو ازلی و ابدی سمجھنا، یا کسی دوسرے کو قادرِ مُطلق تصوّر کرنا، یہ سب (اللہ تعالیٰ کی صفات میں) شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (سورۃ شوریٰ: 11)

ترجمہ :- کوئی چیز اُس کے مثل (مانند) نہیں۔

کیونکہ ہر مخلوق اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے اور جس کسی میں جو صِفت بھی پائی جاتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صِفات ذاتی ہیں، کسی کی عطا کردہ نہیں۔

صفات کے تقاضوں میں شرک

اللہ تعالیٰ عظیم صِفات کا مالک ہے۔ ان صفات کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ صرف

اس کی عبادت کی جائے، اور اسی کے سامنے پیشانیاں جھکائی جائیں۔ حقیقی اِطاعت و محبت کا صرف اسی کو حق دار سمجھا جائے اور یہ ایمان رکھا جائے کہ وہی کارساز ہے۔ اِقتدارِ اعلیٰ صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی کے قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے اور اس کے قوانین کے مقابلے میں کسی کا قانون کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا۔

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ (سورۃ الاسراء: 23)

ترجمہ :- تم صرف اسی کی عبادت کیا کرو۔

وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ (سورۃ البقرہ: 163)

ترجمہ :- اور تمھارا معبود ایک ہی ہے۔ بجز اس کے کوئی معبود نہیں ہے۔

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (سورۃ المائدہ: 44)

ترجمہ :- اور جو کوئی اللہ کے نازل کیے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ تو کافر ہیں۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ (سورۃ یوسف: 40)

ترجمہ :- حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی کو مُنعِم حقیقی سمجھا جائے اور خُلوصِ دل سے اس کا شکر بجالایا جائے یہ شکر صرف یہی نہیں کہ زبان سے "یا اللہ تیرا شکر ہے" کہہ دیا جائے بلکہ اس کی حقیقی صورت یہ ہے کہ اپنی اِطاعت و بندگی کا رُخ صرف اللہ کی ذات کی طرف پھیر دیا جائے اور غیر اللہ کی اطاعت و بندگی کا اپنی عملی زندگی میں کوئی شائبہ تک نہ رہنے دیا جائے۔

ہمیں یہ خوب خیال رکھنا چاہیے کہ شرک صرف یہی نہیں کہ پتھر یا لکڑی کے بُت بنا کر ان کو پوجا جائے بلکہ یہ بھی شرک ہے کہ ہر چھوٹی بڑی حاجت پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے لو لگائی جائے۔ ہر مشکل میں اللہ تعالیٰ ہی کو قادرِ مطلق اور مُسَبِّبُ الاسباب سمجھ کر اسی کے فیض و کرم سے اپنی مجبوریوں کا حل تلاش کرنا چاہیے۔

بے شمار مسلمان ایسے ملتے ہیں جو زبانی طور پر تو اللہ تعالیٰ پر ایمان کا دعوے کرتے ہیں لیکن عملاً اپنی اولاد، روزگار، صحت اور دیگر مسائل کو انسانوں کے سامنے اسی عاجزی اور اُمید سے پیش کرتے ہیں، جس طرح صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنا چاہیے انسان کی اس کمزوری کا بیان اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ۝ (سورۃ یٰسین: 75،74)

ترجمہ:۔ اور پکڑتے ہیں اللہ کے سوائے دوسرے کارساز کہ شاید (اِن کی طرف سے) اُن کو مدد پہنچے۔ (حالانکہ) وہ ان کی مدد کی (کوئی) طاقت نہیں رکھتے اور یہ ان کی فوج ہو کر پکڑے آئیں گے۔

آگے فرماتے ہیں۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ (سورۃ الملک: 21)

ترجمہ: بھلا وہ کون ہے جو روزی دے تم کو۔ اگر اللہ روک لے اپنی روزی۔

انسانی زندگی پر عقیدہ توحید کے اثرات

توحید کا عقیدہ دل میں راسخ ہو جائے۔ شرک کے اندیشے ذہن سے نکل جائیں اور انسان کو کامل یقین ہو جائے کہ اللہ کے سوا نہ کسی کے پاس طاقت ہے نہ قدرت ہے۔ نہ اس کے سوا کوئی کچھ دے سکتا ہے اور نہ اس کے دیئے ہوئے کو کوئی روک سکتا ہے۔ نہ کسی اور کے ہاتھ میں نفع ہے نہ نقصان۔ تو اس کی شخصیت کو بہت مستحکم بنیادیں مل جاتی ہیں اس کے فکر اور عمل میں ہم آہنگی آ جاتی ہے اور اس کی زندگی کے سارے پہلو سنور جاتے ہیں۔ اس کی نکھری ہوئی شخصیت کی کچھ نمایاں نشانیاں یہ ہوتی ہیں۔

1۔ خودداری

توحید پر یقین رکھنے والا خوددار اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اسے یہ یقین ہو جاتا ہے

کہ قدرت رکھنے والا صرف اللہ ہے۔ باقی سب میرے جیسے انسان ہیں۔ ضعیف، کمزور اور بے بس۔ اس لیے اس کا سر صرف اللہ کے سامنے جھکتا ہے۔ وہ نہ اپنے جیسے انسانوں کے دروازوں پر حاضری دیتا ہے نہ انسانوں کی بنائی ہوئی بے جان مورتیوں کو سجدہ کرتا ہے اس کے لیے ایک اللہ کافی ہے۔

2۔ انکسار

عقیدۂ توحید سے تواضع اور انکسار پیدا ہوتا ہے، کیونکہ توحید کا پرستار جانتا ہے کہ وہ اللہ کے سامنے بے بس ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہے سب اسی کا دیا ہوا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ دینے پر قادر ہے وہ چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ لہٰذا بندے کے لیے تکبر و غرور کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسے تواضع وانکسار ہی زیب دیتا ہے۔

3۔ وُسعتِ نظر

عقیدۂ توحید کا قائل تنگ نظر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اس رحمٰن و رحیم پر ایمان رکھتا ہے جو کائنات کی ہر چیز کا خالق اور سب جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اس کی رحمتوں سے سب فیض یاب ہوتے ہیں۔ اس عقیدے کے نتیجہ میں مومن کی ہمدردی، محبت اور خدمت عالمگیر ہو جاتی ہے اور وہ ساری مخلوقِ الٰہی کی بہتری کو اپنا نصبُ العین بنا لیتا ہے۔

4۔ اِستقامت و بہادری

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے اِستقامت اور بہادری پیدا ہوتی ہے۔ مومن جانتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور محتاج ہے اللہ تعالیٰ ہی کو سب قدرت حاصل ہے سر اسی کے سامنے جھکنا چاہیے اور اسی سے ڈرنا چاہیے۔ اس عقیدے کے ذریعے مومن کے دل سے دوسروں کا خوف نکل جاتا ہے اور وہ اِستقامت و بہادری کی تصویر بن جاتا ہے اور کسی بڑے سے بڑے فرعون کا خوف اپنے دل میں نہیں لاتا، خواہ بدر و اُحد کی لڑائی

ہو یا خُنین و خندق کی، وہ ہر جگہ لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمزدہ ہوتے ہیں) کا پیکر بن جاتا ہے۔

5 - رجائیت اور اِطمینانِ قلب

عقیدۂ توحید کا ماننے والا مایوس اور نا اُمید نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت باری تعالیٰ کی رحمت پر آس لگائے رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ وہ تمام خزانوں کا مالک ہے اور اس کا فضل و کرم بے حد حساب ہے۔ انسان جس قدر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس کے دل کو اتنا ہی اِطمینان نصیب ہوتا ہے۔

6 - پرہیزگاری

عقیدۂ توحید سے انسان کے دل میں پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر مومن کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام ظاہر اور پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔ اگر بندہ پوشیدگی میں کوئی جرم کرے تو ممکن ہے لوگوں کی نگاہوں سے چھپ جائے، مگر اپنے اللہ کی نظر سے نہیں چھپ سکتا، کیونکہ وہ تو دلوں کے ارادوں کو بھی جانتا ہے۔ یہ ایمان انسان میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ وہ خَلوت و جَلوت میں کہیں بھی گناہ کا اِرتکاب نہ کرے اور ہمیشہ نیک اَعمال بجا لائے، کیونکہ مُعاشَرہ اسی وقت صحیح معنوں میں انسانی مُعاشَرہ بن سکتا ہے جب لوگوں کے اَعمال درست ہوں۔ توحید پر ایمان، عَمَلِ صالح کی بُنیاد فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ انسان کے تمام اَعمال اس کے دل کے تابع ہوتے ہیں اگر دل میں ایمان کی روشنی موجود ہو تو عملِ صالح ہوگا۔

نجات و فَلاح کے لیے ایمان اور عَمَلِ صالح دونوں کا ہونا ضروری ہے اس لیے قرآن مجید میں جا بجا ارشاد ہوا۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے) جس طرح کوئی درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح ایمان کی پہچان عملِ صالح سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص زبان سے ایمان کا دعویٰ

کرتا ہے مگر اس کے اعمال اچھے نہیں تو یہی سمجھا جائے گا کہ ایمان نے اس کے دل کی گہرائیوں میں پوری طرح جگہ نہیں پکڑی۔ غرضیکہ عقیدۂ توحید اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ نیک اعمال بجا لائے جائیں اور بُرے اعمال سے بچا جائے۔

7 - توکّل علی اللہ

مومن دُنیا کے اسباب کو ترک نہیں کرتا بلکہ ان سے پُورا پُورا اِستفادہ کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مُؤثرِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کو جانتا ہے اور ہر حال میں اس کی ذات پر بھروسہ کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْٓا (یونس: 84)

ترجمہ:۔ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرتے رہو۔

رِسالت

اِنسان کو ذاتِ الٰہی کی صحیح پہچان اس کے رسُولوں کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اس لیے اسلام کے سلسلۂ عقائد میں توحید کے بعد رِسالت کا درجہ ہے (رسُول کے لغوی معنی ہیں پیغام دے کر بھیجا ہوا یعنی پیغام پہنچانے والا۔ دین کی اصطلاح میں رسُول وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے منتخب فرمایا ہو (رسُول کو نبی بھی کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں خبر دینے والا۔ رسُول کو ہم پیغمبر بھی کہتے ہیں، یعنی پیغام لانے والا)

رِسالت ملنے سے پہلے بھی رسُول کی زندگی اپنی قوم میں بہترین زندگی ہوتی ہے۔ وہ پاکباز، نرم خو، نیک طِینت، سچّا اور اَمانت دار ہوتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام سناتے وقت کوئی اس کو بے اعتبار یا جھوٹا نہ کہہ سکے۔ اور وہ دعویٰ سے کہے:۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ (یونس: 16)

ترجمہ:۔ میں نے اس سے پہلے تمہارے درمیان کافی زندگی گزاری ہے۔

وحی

رِسالت کے لیے اگرچہ کوئی عمر مُقرر نہیں لیکن اکثر رسولوں کو کافی پُختہ عمر میں وحی کے ذریعے رِسالت ملی ہے (وحی کے معنی ہیں دل میں چپکے سے کوئی بات ڈالنا، ارشاد کرنا یا کسی فرشتے کے ذریعہ پیغام پہنچانا۔ دین کی اِصطلاح میں اس سے مُراد اللہ تعالیٰ کا وہ پیغام ہے جو اس نے اپنے کسی رُسول پر فرشتے کے ذریعے نازل کیا ہو یا براہ راست اس کے دل میں ڈال دیا ہو یا کسی پردے کے پیچھے سے اسے سنوا دیا ہو۔ قرآن مجید میں وحی کا لفظ ان تینوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

وَمَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْياً اَوْمِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْيُرْسِلَ رَسُوْلاً فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَايَشَآءُ (شوریٰ: 51)

ترجمہ:- اور کسی بَشر کا یہ مقام نہیں کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے، یا وہ کسی قاصد کو بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی مختلف اقوام کی طرف رُسول بھیجے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:-

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلاً (سورۃ النحل: 36)

ترجمہ:- اور ہم نے ہر اُمت میں رُسول بھیجے۔

اللہ کی دُنیا بُہت پھیلی ہُوئی ہے، اس لیے اللہ کے تمام رُسولوں کی صحیح تعداد نہ جانے کتنی ہوگی۔ کچھ لوگوں نے یہ تعداد کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی ہے۔ ممکن ہے اس سے بھی زیادہ ہو یا کم ہو۔ ان میں سے صرف چند انبیاء کے نام قرآن مجید میں ذکر کیے گئے ہیں جن کے ناموں کے ساتھ عرب مانوس تھے۔ بہت سے انبیاء کے نام قرآن مجید میں نہیں ہیں۔ جس طرح قرآن مجید میں ارشاد ہے:-

مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ

(سورۃ المومن: 78)

ترجمہ:- (ان رسولوں) میں بعض کا حال ہم نے آپ سے بیان کیا ہے اور بعض کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔

اس لیے ہر قوم کی اسلام سے پہلے کی برگزیدہ ہستیوں کا اِحترام کرنا چاہیے۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی نبی ہو اور بعد میں اس کی تعلیمات لوگ بھُول گئے ہوں۔

انبیاء کا یہ سلسلہ حضرت مُحمّد مُصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ختم ہو گیا اور اب قیامت تک تمام انسانوں پر صرف آپؐ کی پیروی فرض ہے لیکن دین کی رو سے تمام گزرے ہوئے انبیاء کی نبوت پر ایمان لانا ضروری ہے، ان میں کوئی فرق کرنا جائز نہیں۔

لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍمِّنْ رُّسُلِهٖ (سورۃ البقرہ: 285)

ترجمہ:- "ہم اس کے رسولوں (پر ایمان لانے) میں کسی میں تفریق نہیں کرتے"۔

یہ سب اللہ کے رسول نیک پاک اور سچّے تھے۔ سب نے توحید کی تعلیم دی ہے اور سب کی نبوت پر ہمارا ایمان ہے۔ البتہ ان کی تعلیمات میں لوگوں نے ردو بدل کیا ہے۔ اور ان کی صحیح تعلیم وہی ہے جو قرآن مجید نے بیان فرمائی ہے۔

رُسول کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انسانوں ہی میں سے رسول بھیجے کیونکہ انسان کی رہنمائی کے لیے انسان ہی رُسول ہو سکتا ہے۔ اِرشادِ ربانی ہے:-

وَمَآاَرْسَلْنَامِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالاً نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ ۝ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ

(سورۃ النحل: 43،44)

ترجمہ:- ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رُسول بھیجے ہیں، آدمی ہی بھیجے ہیں۔ جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے۔ اگر تم لوگ خود نہیں جانتے تو اہلِ ذکر سے پوچھ لو۔ پچھلے رسولوں کو بھی ہم نے (اسی طرح) روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا، اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ

تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح و توضیح بیان کر دو، جو اُن کے لیے اُتاری گئی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خود اپنی زندگی میں قرآنی اصولوں پر مبنی ایک عملی نظاہرہ کرنا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ آکر پیغام سنا دیتے۔ بلکہ اس پیغام کے مطابق انسانی زندگی کی اصلاح بھی آپؐ کی ذمہ داری تھی۔ پیغامِ الٰہی فرشتوں کے ذریعے سے بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ مگر محض پیغام بھیجنے سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس عظیم مقصد کی تکمیل و تفصیل کے لیے لازمی تھا کہ اس پیغام کو بنی نوع انسان ہی کا ایک فرد لے کر آئے جو کہ انسانِ کامل ہونے کے باوجود بہرحال انسان اور بشر ہو۔ اس کو مشکلات اور مجبوریوں کا اسی طرح سامنا کرنا پڑتا ہو جس طرح اس کی اُمت کے ایک معمولی فرد کو اور جو ساری دُنیا کے سامنے ایک ایسی سوسائٹی کو بطور مثال رکھ دے جس کا اِجتمائی نظام اسی پیغامِ الٰہی کے مَنشا کی شرح ہو۔

انبیاء کی خصوصیّات

انبیاء کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں :۔

1 - بشریّت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہبری کے لیے ہمیشہ کسی انسان ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ کسی جن یا فرشتے کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ (سورۃ یوسف: 109)

ترجمہ :۔ اور جتنے رسُول بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے وہ سب مرد ہی تھے۔

انبیاء اگرچہ انسان ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے اوصاف سے نوازا ہوتا ہے جو دوسروں میں نہیں ہوتے۔ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ انسان، پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر تو کوئی فرشتہ ہونا چاہیے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (سورۃ الاسراء: 95)

ترجمہ :۔ اُن سے کہو (کہ) اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم اُن کے لیے آسمان سے ضرور کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر بھیجتے۔

2 - امین

رِسالت ایک ایسی نعمت ہے جو محض اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ کوئی شخص اپنی محنت و کاوِش سے اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو محض عبادت و ریاضت سے حاصل ہو جائے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ جسے چاہے دے دے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ (سورۃ الجمعہ: 4)

ترجمہ :۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

تاہم یہ منصب جن لوگوں کو عطا کیا گیا وہ تمام نیکی، تقوی، ذہانت اور عزم و ہمت جیسی بلند صفات کے مالک تھے۔ نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیے گئے احکامات من و عن انسانوں کو پہنچا کر اپنی امانت کا حق ادا کرتے ہیں۔

3 - تبلیغِ احکامِ الٰہی

پیغمبر جو احکام و تعلیمات لوگوں کے سامنے بیان فرماتا ہے وہ تمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ پیغمبر اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا ترجمان ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ۙ (سورۃ النجم: 3،4)

ترجمہ :۔ اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے۔ یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا۔

4 - معصُومیت

اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر معصوم اور گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کے اَقوال اور اعمال شیطان کے عمل دخل سے محفوظ ہوتے ہیں۔ نبی کا کردار بے داغ ہوتا ہے۔ وہ ایسا انسانِ کامل ہوتا ہے جو بے حد روحانی طاقت کا مالک ہوتا ہے۔ نبی کا کوئی کام نفسانی

خواہشات کے تابع نہیں ہوتا۔

5 - واجبِ اطاعت

انبیاء کی اطاعت و پیروی ضروری ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (سورۃ النساء 64:4)

ترجمہ:۔اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ اس کا حکم مانا جائے اللہ کے فرمانے سے۔

نبی، اللہ کا راستہ دکھاتا ہے۔اس لیے اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔اسی طرح پیغمبر کتابُ اللہ کا شارح ہوتا ہے۔اُمّت کا مُعلّم ہوتا ہے۔اُمّت کے لیے نمونۂ تقلید ہوتا ہے۔قانونِ الٰہی کا شارح ہوتا ہے اور قاضی اور حَکَم ہوتا ہے۔

رسالتِ محمدؐ اور اس کی خصوصیات

حضرت آدم علیہ السّلام سے نبوّت کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ خاتمُ المرسلین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر آکر اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیائے کرام کو جو کمالات علیحدہ علیحدہ عطا فرمائے تھے، نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات میں وہ تمام شامل کر دیے۔رسالتِ محمدی بڑی نمایاں خصوصیات رکھتی ہے، جن میں سے چند ایک یہ ہیں:۔

1 - عمومیّت

رسُول اکرمؐ سے پہلے آنے والے انبیاء کی نبوت کسی خاص قوم یا مُلک کے لیے ہوتی تھی۔مگر آپؐ کی نبوت قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (سورۃ الاعراف: 158)

ترجمہ:۔(اے محمدؐ) تو کہہ اے لوگو! میں رسول ہوں اللہ کا تم سب کی طرف۔

2 - پہلی شریعتوں کا نسخ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شریعت نے آپؐ سے پہلے آنے والے انبیاء کی شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔اب صرف شریعتِ محمدی پر عمل کیا جائے گا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران: 3:85)

ترجمہ:۔اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا، سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

3 - کاملیّت

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اللہ کے دین کی تکمیل ہو گئی۔آپؐ کو وہ دینِ کامل عطا فرمایا گیا، جو تمام انسانیّت کے لیے کافی ہے۔اس لیے کسی دوسرے دین کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (سورۃ المائدۃ: 3)

ترجمہ:۔آج میں نے مکمل کر دیا تمہارے لیے دین تمہارا اور پوری کر دی تم پر اپنی نعمت، اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین۔

4 - حفاظتِ کتاب

پہلے انبیاء پر نازل ہونے والی کتابیں یا تو بالکل ناپید ہو چکی ہیں یا اپنی اصلی صورت میں باقی نہیں رہیں۔کیونکہ ان میں بڑے پیمانے پر ردّوبدل ہو چکا ہے۔جس سے ان کتابوں میں صحیح اور غلط تعلیمات اس قدر گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ صحیح کو غلط سے جدا کرنا بے حد مشکل

ہوگیا ہے۔ مگر خاتمُ الرُّسُل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب قرآن کی آیات چودہ سو سال گزرنے کے باوجود بالکل اسی صُورت میں موجود ہیں جس طرح نازل ہوئی تھیں۔ اس کے ایک حرف میں بھی تبدیلی نہیں ہُوئی۔ قرآن مجید نہ صرف یہ کہ تحریری طور پر محفوظ ہے بلکہ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں بھی موجود ہے۔

5۔ سُنّتِ نبوی کی حِفاظت

اللہ کی طرف سے رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سُنّت کی حفاظت کا بھی عظیم الشان انتظام کیا گیا ہے۔ ہر دَور میں مُحدِّثینِ کرام کی ایسی جماعت موجود رہی جس نے سُنّتِ نبوی کی حفاظت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ چونکہ سُنّت، قرآن مجید کی شرح ہے، جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہے، اس لیے اللہ نے جس طرح قرآن مجید کی حفاظت کا انتظام کیا۔ اسی طرح سُنّتِ نبوی کی حفاظت کا انتظام بھی فرما دیا۔

6۔ جامِعیّت

پہلے انبیاء کی رسالت کسی خاص قوم اور دَور کے لیے ہوتی تھی۔ اس لیے ان کی تعلیمات کا تعلق اسی قوم اور دَور سے ہوتا تھا۔ مگر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ تمام زمانوں کے لیے رسُول بن کر آئے۔ اس لیے آپؐ کی تعلیمات میں اس قدر جامعیت ہے کہ قیامت تک کے انسان، خواہ کسی بھی قوم یا دور سے تعلق رکھتے ہوں، ان تعلیمات سے رہبری حاصل کر سکتے ہیں۔

7۔ ہمہ گیری

رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو تعلیمات پیش فرمائیں، ان کی حیثیت محض نظری نہیں رکھی، بلکہ خود ان پر عمل کر کے اور انہیں عملی زندگی میں نافذ کر کے دکھایا۔ جب آپؐ کی حیاتِ طیبہ پر نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ عائلی زندگی ہو یا سیاسی، بچّوں سے

برتاؤ ہو یا بڑوں سے معاملہ، امن کا دَور ہو یا جنگ کا زمانہ، عبادت کی رسمیں ہوں یا معاملات کی باتیں، قرابت کے تعلقات ہوں یا ہمسائیگی کے روابط، زندگی کے ہر پہلو میں سیرتِ مُحمّدی انسانوں کے لیے بہترین نمونۂ عمل ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۃ الاحزاب: 21)

ترجمہ:۔ تمھارے لیے اللہ کے رسُول (کی سیرت) میں بہترین نمونہ ہے۔

8۔ ختمِ نبوّت

ختم نبوت کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السّلام سے نبوت کا جو سلسلہ شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے کئی انبیاء آئے، کچھ کے پاس اپنی علیحدہ آسمانی کتابیں اور مستقل شریعتیں تھیں اور کچھ اپنے سے پہلے انبیاء کی کتابوں اور شریعتوں پر عمل پیرا تھے۔ یہ سلسلہ حضرت مُحمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آکر ختم ہوگیا۔ آپؐ پر ایک جامع اور ہمیشہ رہنے والی کتاب نازل ہُوئی اور آپؐ کو ایک کامل شریعت دی گئی۔ آپؐ آخری نبی ہیں۔ آپؐ پر دین کی تکمیل ہُوئی اور آپؐ کی شریعت نے پہلی تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔ آپؐ کے بعد اب کسی قسم کا کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا، کیونکہ:۔

1۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تمام انسانوں کے لیے رسُول بنا کر بھیجا ہے اور قیامت تک ہر قوم اور ہر دور کے انسانوں کے لیے آپؐ کی رسالت عام ہے اور سب کے لیے آپؐ کی تعلیم کافی ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر دین کو مکمل کر دیا۔ آپؐ کی شریعت کامل ہے۔ اور آپؐ کی تعلیمات، ہدایت کی مکمل ترین شکل ہیں۔ اس لیے اب کسی دوسرے نبی کی کوئی ضرورت نہیں۔

3۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر نازل کردہ کتاب قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور وہ کتاب چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اس شان سے محفوظ ہے کہ اس

کے ایک حرف میں بھی کوئی ردّ و بدل نہیں ہوسکا۔اس کتاب کا ایک ایک حرف محفوظ ہے، کاغذ کے صفحات پر بھی اور حُفّاظ کے سینوں میں بھی۔آپؐ کی تمام تعلیمات اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہیں جو تمام دنیا کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔اس لیے آپؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا۔اب ہر طالب ہدایت پر لازم ہے کہ حضرت خاتمُ المرسلین پر ایمان لائے اور آپؐ ہی کے بتائے ہوئے طریقے پر چلے۔

عقیدۂ ختمِ نبوت، قرآن، حدیث اور اجماعِ اُمّت تینوں سے ثابت ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط

(سورۃ الاحزاب: 40)

ترجمہ:۔محمدؐ باپ نہیں کسی کا تمھارے مردوں میں سے لیکن اللہ کا رسول ہے اور مُہر سب نبیوں پر۔

عربی زبان میں ختم کے معنی ہیں مُہر لگانا، بند کرنا، آخر تک پہنچانا، کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانا۔تمام مفسرین نے اس آیت کریمہ میں خاتم کے معنی آخری نبیؐ کے بیان کیے ہیں۔حدیث مبارک میں ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: "بنی اسرائیل کی رہنمائی انبیاءؑ کیا کرتے تھے۔جب ایک نبی وفات پا جاتا تو دوسرا نبی اُس کا جانشین ہوتا۔مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔" ایک اور حدیث میں آتا ہے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: "میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے عمارت بنائی اور خوب حسین وجمیل بنائی۔مگر ایک کنارے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی اور وہ اینٹ میں ہوں۔"

تمام صحابہ کرام کا اس بات پر اجماع تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔یہی وجہ ہے کہ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں جن لوگوں نے دعویٰ نبوت کیا صحابہ کرام نے ان کے خلاف جہاد کیا۔

9- ناموسِ رسالت

اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسُل کے احترام کی تعلیم دی ہے۔اسے شریعت مطہرہ کی اصطلاح میں ناموس رسالت کہا جاتا ہے۔انبیاء و رسُل میں سے کسی ایک کی بھی توہین، استہزاء اور گستاخی ناقابل معافی جرم قرار دیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا (سورۃ الاحزاب: آیت ۵۷)

ترجمہ: "بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں ان پر لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

اس آیت کریمہ کے ذریعے ریاست کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ شاتم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سزائے موت دے دے چاہے یہ گستاخ غیر مسلم شہری ہو یا مدعی اسلام ہو، اس پر ساری امت کا اجماع ہے۔تاہم انفرادی طور پر کوئی شخص کسی کو یہ سزا نہیں دے سکتا۔

اس لئے مجموعہ تعزیرات پاکستان میں دفعہ (C) 295 کے اضافے سے قرآن و سنت کے احکام اور امت مسلمہ کے ایمانی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

جس کے مطابق آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں توہین آمیز رائے کا استعمال کرنا: "جو کوئی آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کی بذریعہ الفاظ، زباں یا تحریری یا دکھائی دینے والی اشکال کے ذریعے یا بزریعہ تہمت یا طعن آمیز اشارے یا در پردہ الزام کے ذریعے براہ راست یا بالواسطہ توہین کرے گا تو اسے سزائے موت ہوگا۔" اس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و جملہ انبیاء و رسل علیہم السلام کے ناموس کا تحفظ کیا گیا ہے۔

ملائکہ پر ایمان

ملائکہ کا لفظ جمع ہے، اس کا واحد "مَلَک" ہے جس کے لفظی معنی پیغام رساں کے ہیں چونکہ یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے اَحکام بندوں تک لاتے اور نافذ کرتے ہیں اس لئے انھیں ملائکہ کہا جاتا ہے۔ فرشتے نورانی مخلوق ہیں اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی اِطاعت کرتے ہیں۔

ملائکہ یا فرشتوں پر ایمان لانا، دین کے بنیادی عقائد میں شامل ہے۔ ملائکہ کے وجود اور ان کے کاموں کے بارے میں قرآن مجید میں متعدد آیات ملتی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی تابع مخلوق ہے اور ان سے گناہ یا خطا کا صدور ممکن نہیں۔ تخلیقِ انسانی کے وقت بھی فرشتے موجود تھے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے جذبہ اِطاعت کے تحت عرض کیا تھا کہ زمین میں کوئی اور خلیفہ (انسان) پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم ہر حکم کی تعمیل کے لیے دست بستہ موجود ہیں۔ فرشتے اِطاعت وعبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَ لَهٗ يَسْجُدُوْنَ ○ (الاعراف:206)

ترجمہ: ملائکہ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اس کے آگے سجدے کرتے ہیں۔

فرشتوں کے ذمے اللہ تعالیٰ نے مختلف کام لگا رکھے ہیں، جو وہ پوری تندہی سے سرانجام دیتے ہیں۔ چار فرشتے بہت مشہور ہیں۔ ان میں سے حضرت جبرائیل علیہ السلام انبیاء کرام کے پاس وَحیِ اِلٰہی لانے کا کام کرتے رہے ہیں۔ حضرت میکائیل علیہ السلام کے ذمے بارشوں اور ہواؤں کے نظام کی نگرانی ہے۔ مَلَکُ الموت حضرت عزرائیل علیہ السلام کے ذمے جان دار مخلوقات کی اَرواح قبض کرنا ہے جب کہ حضرت اِسرافیل علیہ السلام کے ذمے قیامت برپا کرنے اور پھر مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے اللہ کے حکم سے صور پھونکنا ہے۔

اپنی بنیادی تخلیق اور ادائیگی فرض کے لحاظ سے فرشتوں کی کئی قسمیں اور درجے ہیں

سورہ فاطر میں ہے:

رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ

ترجمہ:۔ "ایسے پیغام رساں (فرشتے) موجود ہیں جن کے دو دو تین تین اور چار چار بازو ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہے اِضافہ کرتا ہے"۔

فرشتے نورانی مخلوق ہیں البتہ یہ حسبِ ضرورت مختلف جسمانی شکلیں اختیار کر سکتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت مریم علیہا السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے مختلف انسانی شکلوں میں ظاہر ہوئے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مجلس میں انسانی شکل میں ظاہر ہوئے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ ایسے فرشتے مقرر کر دیے ہیں جو اسے حادثات اور مضر اشیاء سے بچاتے رہتے ہیں۔ مومنوں اور نیکی کے کام اختیار کرنے والوں کے لیے دُعائے مغفرت اور نزولِ رحمت کی دعائیں کرتے ہیں۔ مُشکل حالات میں دل کو تسلی اور بشارتیں دیتے ہیں اور نیکی کے کاموں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ (حٰمٓ السجدہ: ۳۰)

ترجمہ:۔ "جن لوگوں نے اِقرار کیا کہ اللہ ہمارا پالنے والا ہے اور پھر اس قول پر ثابت قدم رہے۔ تو ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے"۔

اسی طرح ہر انسان کے اَعمال کی نگرانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتے مقرر کر دیے ہیں۔ جو اس کے ہر چھوٹے بڑے عمل کو محفوظ کرتے جاتے ہیں۔ جو کہ قیامت کے دن اعمال ناموں کی شکل میں ہر شخص کے سامنے پیش کر دیے جائیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ○ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ○

ترجمہ: "بے شک تم پر نگران (فرشتے) مقرر کیے گئے ہیں۔ بہت معزز اور تمھارے اَعمال

لکھنے والے''۔ اسی طرح ارشاد ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ○

ترجمہ: ''جولفظ بھی اُس (انسان) کے مُنہ سے نکلتا ہے اس کو محفوظ کرنے کے لیے ایک چست نگران (فرشتہ) موجود ہے''۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے عرش کو اُٹھانے، انسانوں کے اعمالنامے پیش کرنے، جہنم میں مجرموں کو سزا دینے اور جنت میں نیکوکاروں کی خدمت کرنے کے جُملہ اُمور مختلف فرشتوں کے سپُرد ہیں۔

فرشتوں پر ایمان لانے سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا شعور بڑھتا ہے۔ اس کے قائم کردہ عظیم الشان نظام اور بے پایاں رحمتوں کا احساس ہوتا ہے۔ فرشتوں کی موجودگی پر ایمان کی وجہ سے انسان کو یہ احساس رہتا ہے کہ میرے ہر چھوٹے بڑے عمل کی نگرانی کی جارہی ہے۔ اسی طرح میدانِ جہاد اور دین کے مُشکل کاموں میں فرشتوں کی تسلیاں ثابت قدمی کا باعث اور ان کی دعائیں انسانوں کی مغفرت کا ذریعہ بنتی ہیں۔

آسمانی کتابیں

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تمام رسولوں پر ایمان لایا جائے۔ رسُولوں پر ایمان لانے کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کا سچا پیغمبر مانا جائے اور ان کی تعلیمات کو برحق تسلیم کیا جائے۔ رسولوں پر نازل ہونے والی کتابیں، ربانی تعلیمات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ لہٰذا رسولوں پر ایمان لانے کے لیے لازم ہے کہ ان پر نازل ہونے والی کتابوں پر بھی ایمان لایا جائے۔ ایمان والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج

ترجمہ: ''اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر، جو نازل ہُوا تیری طرف، اور اُس پر، جو نازل ہُوا تجھ سے پہلے۔

کل آسمانی کتابیں بہت سی ہیں جن میں سے چار بہت مشہور ہیں۔

1- زبور جو حضرت داوٗد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔
2- توریت جو حضرت موسٰی علیہ السلام پر نازل ہوئی۔
3- انجیل جو حضرت عیسٰی علیہ السلام پر نازل ہوئی۔
4- قرآن مجید جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوا۔

ان کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کے صحیفے بھی تھے۔ اِن تمام کتابوں میں دین کی بُنیادی باتیں مشترک تھیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی صفاتِ کاملہ، اللہ تعالیٰ کی عبادت، رسالت پر ایمان، یوم آخرت پر ایمان اور اَعمال کی جزاوسزا۔ مگر چونکہ ہر دور میں وقت کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اس لیے شریعت کے تفصیلی قوانین اِن کتابوں میں جدا جدا تھے۔ بعد میں آنے والی کتابوں نے پہلی کے تفصیلی قوانین کو منسوخ کر دیا۔ اسی طرح قرآن نے جو کہ سب کتابوں کے بعد نازل ہوا، پہلی تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔ اور اب صرف قرآن کے بتائے ہوئے قوانین پر عمل کرنا لازم ہے، پہلی کتابوں کے بتائے ہوئے قوانین پر نہیں۔ پہلی کتابوں پر ایمان لانے کا اَب مطلب یہ ہے کہ وہ بھی سچّی کتابیں تھیں اور ان کے بیان کردہ قوانین پر ان کے زمانے میں عمل کرنا ضروری تھا۔ مگر اَب صرف قرآنی ہدایات ہی پر عمل کیا جائے گا۔

آخری آسمانی کتاب

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر نازل ہوئی۔ اور قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے، یہ سرچشمہ ہدایت ہے۔

قرآن مجید کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں:

1- محفوظ ہونا

چونکہ قرآن مجید قیامت تک کے ہر دور اور ہر قوم کے انسانوں کے لیے رُشد ہدایت کا ذریعہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا خاص وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد

باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ o

ترجمہ: ''ہم نے خود اُتاری ہے یہ نصیحت اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں''۔

یہی وجہ ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود قرآن مجید کا ایک ایک لفظ محفوظ ہے۔ اللہ کی طرف سے اس کی حفاظت کا ایسا انتظام کردیا گیا ہے، کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تحریف (ردّوبدل) سے محفوظ ہوگیا ہے۔ جب کہ دوسری آسمانی کتابوں میں بڑا ردّوبدل ہوچکا ہے۔ ان کا بہت سا حصّہ ضائع ہو چکا ہے اور جو باقی بچا اس میں بھی لوگوں نے اپنی طرف سے کئی باتیں شامل کردیں۔ اب یہ کتابیں کہیں بھی اصلی شکل میں دستیاب نہیں جب کہ قرآن مجید اپنی خالص شکل میں اب تک موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔

2۔ قرآن کی زندہ زبان

قرآن مجید جس زبان میں نازل ہوا، وہ ایک زندہ زبان ہے۔ آج بھی دنیا کے بیس سے زیادہ ممالک کی قومی زبان عربی ہے اور یہ زبان دُنیا کی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ جب کہ پہلی آسمانی کتابیں جن زبانوں میں نازل ہوئیں وہ مردہ ہو چکی ہیں۔ جن کو سمجھنے والے بہت کم لوگ ہیں۔

3۔ عالمگیر کتاب

باقی آسمانی کتابوں کے مُطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ صرف کسی ایک خاص ملک یا خاص قوم کے لوگوں کے لیے تھیں۔ مگر قرآن مجید ساری دُنیائے انسانیت کے لیے پیغام ہدایت ہے۔ یہ کلام پاک یٰاَیُّهَا النَّاسُ (اے لوگو) کا خطاب کر کے تمام انسانوں کو ہدایت کا پیغام دیتا ہے۔ یہ ایک عالمگیر کتاب ہے، جس کی تعلیمات ہر دور اور ہر ملک میں قابل عمل ہیں۔

اس کتاب کی تعلیمات فطری ہیں۔ اس لیے کہ ہر دور کا انسان یوں محسوس کرتا ہے۔ جیسے یہ اسی کے دور کے لیے نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کی تعلیمات ہر قوم و ملک اور ہر طرح کے ماحول

میں بسنے والے افراد کے لیے یکساں طور پر نفع بخش اور عقل کے عین مطابق ہیں۔

4۔ جامع کتاب

پہلی آسمانی کتابوں میں سے کچھ کتابیں صرف اخلاقی تعلیمات پر مشتمل تھیں۔ بعض صرف مُناجات اور دُعاؤں کا مجموعہ تھیں۔ کچھ صرف فقہی مسائل کا مجموعہ تھیں۔ بعض میں صرف عقائد کا بیان تھا اور بعض صرف تاریخی واقعات کا مجموعہ تھیں مگر قرآن مجید ایسی جامع کتاب ہے جس میں ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں عقائد و اعمال کا بیان بھی ہے۔ اخلاق و روحانیت کا درس بھی، تاریخی واقعات بھی ہیں اور مُناجات بھی۔ غرضیکہ یہ ایسی کتاب ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کرتی ہے۔

5۔ عقل وتہذیب کی تائید کرنے والی کتاب

پہلی آسمانی کتابوں میں سے بعض کتابیں ایسی باتوں پر بھی مشتمل ہیں جو حقیقت کے خلاف ہیں بلکہ بعض کتابوں میں انتہائی ناشائستہ، غیر اخلاقی باتیں بھی پائی جاتی ہیں (ظاہر ہے یہ باتیں جعلی ہیں جو کسی نے اپنی طرف سے شامل کردی ہیں) جب کہ قرآن مجید ایسی تمام باتوں سے پاک ہے۔ اس میں کوئی بات نہیں جو خلاف عقل ہو اور جسے تجربہ اور دلیل سے غلط ثابت کیا جاسکے۔ اس میں کوئی غیر اخلاقی بات نہیں۔ اس نے تمام انبیاء کا ادب واحترام سکھایا ہے اور سب کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ نیکوکار اور پرہیزگار لوگ تھے۔ ان کی شان کے خلاف جتنی بھی باتیں کہی گئی ہیں، سب جھوٹ اور خلاف واقعہ ہیں۔

6۔ قرآن مجید کا اعجاز

قرآن مجید فصاحت وبلاغت کا وہ شاہکار ہے جس کا مقابلہ کرنے سے عرب وعجم کے تمام فصیح وبلیغ عاجز رہے۔ قرآن مجید میں سب مخالفوں کو دعوت دی گئی ہے کہ ایک چھوٹی سی قرآنی سورت کے مقابلے میں کوئی سورت بنالاؤ۔ مگر کوئی بھی اس کی مثال پیش نہ کرسکا۔ کیونکہ یہ تو خدا کا کلام ہے، کسی بندے کا بنایا ہوا کلام نہیں۔ پھر کوئی بشر اس کا مقابلہ کیسے کرسکتا ہے۔

آخرت

اسلام کے بُنیادی عقائد میں سے ایک عقیدۂ آخرت بھی ہے:۔

مفہوم

لفظ "آخرت"، کے معنی بعد میں ہونے والی چیز کے ہیں۔ اس کے مقابلے میں لفظ "دنیا"، ہے، جس کے معنی قریب کی چیز کے ہیں۔ عقیدۂ آخرت کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے فنا نہیں ہوجاتا بلکہ اس کی رُوح باقی رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب اللہ تعالیٰ اس کی رُوح کو جسم میں منتقل کرکے اسے دوبارہ زندہ کردے گا اور پھر انسان کو اس کے نیک و بد اَعمال کا حقیقی بدلہ دیا جائے گا۔ نیک لوگوں کو ایک ایسی جگہ عنایت کی جائے گی جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بھرپور ہوگی۔ اس کا نام جنت ہے اور بُرے لوگ ایک انتہائی اذیت ناک جگہ میں رہیں گے، جس کا نام جہنم ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۚ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۝ (سورۃ الفطار: 14،13)

ترجمہ:۔ بے شک نیک لوگ بہشت میں (رہوں گے)۔ اور بے شک گناہ گار دوزخ میں۔

آخرت کے سلسلے میں قرآن مجید کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے:۔

انسان کی دنیاوی زندگی اس کی آخرت کی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ دُنیا کی زندگی عارضی اور آخرت کی زندگی دائمی ہے۔ انسان کے تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مرتب نہیں ہوتے۔ بلکہ اس عارضی زندگی میں جن اعمال کا بیج بویا جاتا ہے ان کے حقیقی نتائج آخرت کی زندگی میں ظاہر ہوں گے۔ جس طرح دُنیا کی ہر چیز علیحدہ علیحدہ اپنی ایک عمر رکھتی ہے جس کے ختم ہوتے

ہی وہ چیز ختم ہوجاتی ہے، اسی طرح پورے نظامِ عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہوتے ہی یہ نظام ختم ہوجائے گا اور ایک دوسرا نظام اس کی جگہ لے گا۔

3۔ جب دُنیا کا یہ نظام درہم برہم ہوجائے گا اور ایک دوسرا نظام قائم ہوگا، تو انسان کو ایک نئی جسمانی زندگی ملے گی۔ اس روز ایک زبردست عدالت لگے گی جس میں انسان کے تمام اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ اسے نیک اعمال کی جزا ملے گی اور بُرے اعمال کی سزا۔

مُنکرینِ آخرت کے شُبہات اور ان کا قرآنی جواب

قرآنِ مجید میں عقیدۂ آخرت کو بیان کرتے ہوئے مُنکرین کے شبہات کا بڑے عمدہ انداز میں جواب دیا گیا ہے۔

مُشرکینِ مکہ عقیدۂ آخرت کے مُنکر تھے، اس سلسلے میں ان کے شبہات یہ تھے:۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (سورۃ السجدہ: 10)

ترجمہ:۔ اور کہتے ہیں کیا جب ہم زمین میں نیست و نابود ہوں گے۔ تو کیا کہیں پھر ہم نئے جنم میں آئیں گے۔

مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ (سورہ یٰس: 78)

ترجمہ:۔ کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو، جب کہ وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں۔

لہٰذا

اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ۝ (سورہ الانعام: 29)

ترجمہ:۔ زندگی جو کچھ بھی ہے، بس یہی دُنیا کی زندگی ہے۔ اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے شبہات کو دُور کرتے ہوئے فرمایا۔ تم پہلے موجود نہ تھے تمھیں اللہ نے موجود کیا، جو ذات تمھیں پہلے وجود میں لانے پر قادر ہے۔ وہ تمھارے مر

جانے کے بعد تمھیں دوبارہ زندگی بخشنے پر بھی قادر ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ (سورۃ الروم: 27)

ترجمہ:- اور وہی ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا۔ اور یہ اُس کے لیے بہت ہی آسان ہے۔

قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۙ

(سورۃ یٰسٓ: 79)

ترجمہ:- (اس سے) کہو، انھیں وہی زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔ اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔

كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

(سورۃ البقرہ 28)

ترجمہ: تم بے جان تھے، اُس نے تم کو زندگی عطا کی، پھر وہی تمھاری جان طلب کرے گا، پھر وہی تمھیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔ پھر اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

انسان کی صحیح سوچ اس سے عقیدۂ آخرت پر ایمان لانے کا تقاضا کرتی ہے۔ ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ نیک عمل کا اچھا صلہ اور بُرے عمل کا بُرا بدلہ ہوتا ہے۔ لیکن کیا انسان کے تمام اعمال کے نتائج اس دُنیاوی زندگی میں سامنے آجاتے ہیں؟ ایسا نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات ایک ایسا شخص جس نے پوری زندگی گناہوں میں گذاری ہو، اس جہان میں سزا سے بچا رہتا ہے۔ اسی طرح بعض بے حد نیک لوگ جو عمر بھر نیکیاں کرتے رہے انھیں یہاں نیکی کا پورا بدلہ نہ ملا بلکہ بعض کو تو بے حد اذیتیں دے کر شہید کر دیا گیا۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ "کیا مجرموں کو ان کے جرائم کی سزا کبھی نہیں ملے گی؟ کیا نیکوکار اچھے اجر سے محروم رہیں گے؟ کیا اللہ تعالیٰ کا نظامِ عدل ان کے بارے میں ہمیشہ کے لیے خاموش رہے گا؟ کیا اشرف المخلوقات انسان کو عبث پیدا کیا گیا اور اس کے اعمال کی کوئی قدر و قیمت نہیں؟"

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○

(سورۃ المؤمنون: 115)

ترجمہ:- سو کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمھیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے۔

جب عقل اس پہلو پر سوچتی ہے تو یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ آخرت کی زندگی برحق ہے، جس میں سب لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔ نیک لوگوں کو ان کے اعمال کا بہت اچھا بدلہ ملے گا اور مجرموں کو سخت سزا ملے گی، سوائے ان کے جن کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے۔

اِسلام میں عقیدۂ آخرت کی اہمیّت

آخرت پر ایمان رکھنا اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے۔ قرآن مجید میں اس کی اہمیّت پر زور دیا گیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں متقین کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد ہوا
وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں)

اگر آخرت پر ایمان نہ ہو تو انسان خود غرضی اور نفس پرستی میں ڈوب کر تہذیب و شرافت اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو یکسر بھول جائے اور انسانی معاشرے میں جنگل کا قانون رائج ہو جائے۔

عقیدہ آخرت انسانی معاشرہ کو انسانیت افروز بنانے کا اہم ذریعہ ہے۔ کیونکہ اس سے انسان کے دل میں نیکی پر جزا اور بدی پر سزا کا احساس ابھرتا ہے۔ جو اعمال میں صالحیت پیدا کر دیتا ہے۔ جو شخص آخرت کی زندگی پر ایمان رکھتا ہے اس کی نظر اپنے اعمال کے صرف ان ہی نتائج پر نہیں ہوتی جو اس زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں بلکہ وہ ان نتائج پر بھی نظر رکھتا ہے۔ جو آخرت کی زندگی میں ظاہر ہوں گے۔ اسے جس طرح زہر کے بارے میں ہلاک کرنے اور آگ کے بارے میں جلانے کا یقین ہوتا ہے۔ اسی طرح گناہوں کے ہلاکت خیز ہونے کا بھی یقین ہو جاتا ہے اور جس طرح وہ غذا اور پانی کو اپنے

لیے مفید سمجھتا ہے اسی طرح نیک اعمال کو بھی اپنے لیے نجات و فلاح کا سبب سمجھتا ہے عقیدۂ آخرت کے انسانی زندگی پر بڑے اہم اثرات مرتب ہوتے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:-

1 - نیکی سے رغبت اور بدی سے نفرت

جو شخص آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے تمام اعمال، خواہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ، اس کے نامۂ اعمال میں محفوظ کر لیے جاتے ہیں آخرت میں یہی نامۂ اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوگا اور منصفِ حقیقی فیصلہ فرمائے گا - ان اعمال کا وزن کیا جائے گا - ایک پلڑے میں نیک اعمال اور دوسرے میں بُرے اعمال ہوں گے - اگر نیکی کا پلڑا بھاری ہوا تو کامیابی حاصل ہوگی، اور جنّت میں ٹھکانہ ہوگا اور اگر برائیوں کا پلڑا بھاری ہُوا تو ناکامی ہوگی اور جہنم کا دردناک عذاب چکھنا ہوگا۔

آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص برائیوں سے نفرت کرنے لگتا ہے - کیونکہ اسے علم ہوتا ہے کہ ان کے نتیجہ میں وہ عذاب میں مبتلا ہو سکتا ہے - اُسے نیکیوں سے محبت ہو جاتی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اسے نیکی کا اجر ضرور ملے گا۔

2 - بہادری اور سرفروشی

ہمیشہ کے لیے مٹ جانے کا ڈر انسان کو بزدل بنا دیتا ہے - مگر جب دل میں یہ یقین موجود ہو کہ اس دُنیا کی زندگی چند روزہ ہے، پائیدار اور دائمی زندگی آخرت کی ہے تو انسان نڈر ہو جاتا ہے - وہ اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے سے بھی نہیں کتراتا - وہ جانتا ہے کہ راہِ حق میں جان کا نذرانہ پیش کر دینے سے وہ ہمیشہ کے لیے فنا نہیں ہو جائے گا - بلکہ آخرت کی کامیاب اور پُرمسرت زندگی حاصل کرے گا چنانچہ یہ عقیدہ مومن کے دل میں جذبۂ سرفروشی پیدا کر کے معاشرے میں امن اور نیکی کے پھیلنے کی راہیں ہموار کر دیتا ہے۔

3 - صبر و تحمّل

عقیدۂ آخرت سے انسان کے دل میں صبر و تحمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے - وہ جانتا ہے کہ حق کی خاطر جو بھی تکلیف برداشت کی جائے گی - اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر ملے گا - لہٰذا آخرت پر نظر رکھتے ہُوئے وہ ہر مصیبت کا صبر و تحمل سے مقابلہ کرتا ہے۔

4 - مال خرچ کرنے کا جذبہ

عقیدۂ آخرت انسان کے دل میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ حقیقی زندگی صرف آخرت کی زندگی ہے - لہٰذا اسی دولت سے لگاؤ رکھنا چاہیے جو اس زندگی کو کامیاب بنائے - چنانچہ مومن جتنا بھی دولت مند ہو جاتا ہے، اسی قدر زیادہ سخاوت اور فیاضی کرتا ہے - کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اس کی آخرت کی زندگی سنور جائے گی۔

5 - احساسِ ذمّہ داری

آخرت پر ایمان رکھنے سے انسان میں احساسِ ذمہ داری پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اپنے فرائض میں کوتاہی کرنا جرم ہے، جس پر آخرت میں سزا ملے گی - لہٰذا پوری ذمہ داری سے اپنے فرائض ادا کیے جائیں - آہستہ آہستہ یہ احساس اس قدر پختہ ہو جاتا ہے کہ انسان اپنا ہر فرض پوری دیانت داری سے سرانجام دینے لگتا ہے خواہ اس کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہو یا اللہ تعالیٰ کے حقوق سے۔

سوالات

1 - اِسلام کے بنیادی عقائد کو الگ الگ بیان کرتے ہوئے ان پر مختصر نوٹ لکھیں۔

2 - قرآنی دلائل کی روشنی میں وجُودِ باری تعالیٰ پر بحث کریں۔

3 - شرک کسے کہتے ہیں؟ اس کی کتنی قسمیں ہیں؟

4 - خاتم النبیینؐ کی حیثیت سے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیات بیان کریں۔

5 - آسمانی کتابوں پر مفصل تبصرہ کریں۔

6 - انسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کے اثرات بیان کریں۔

7 - آخرت کے عقیدے پر قرآن مجید کی روشنی میں بحث کریں۔

8 - ملائکہ سے کیا مراد ہے؟ نیز کراماً کاتبین کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

9 - مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیے:

نفخ صور، عقیدۂ آخرت کے انسانی زندگی پر اثرات،

مشہور ملائکہ کے نام اور کام۔

باب دوم

اسلامی تشخص

اسلامی تشخص سے مراد ایسے تمام عقائد و نظریات اور اعمال و اخلاق ہیں، جو ایک مسلمان کو دوسرے تمام انسانوں سے الگ اور ممتاز کرتے ہیں۔

ارکان اسلام

ارکان رکن کی جمع ہے جس کے معنی "ستون" ہیں۔ رکن ایسی چیز کو کہتے ہیں جس پر کسی عمارت کے قائم رہنے کا دارومدار ہو۔ یہاں ارکان اسلام سے مراد دین کے وہ بنیادی اصول و اعمال ہیں جن پر اسلام کی پوری عمارت قائم ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

"بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ"

(بخاری ومسلم)

ترجمہ:- اسلام کی عمارت پانچ ستونوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے (آخری) رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

کلمۂ شہادت

ارکان دین میں سب سے اہم کلمۂ شہادت ہے جس کے الفاظ ہیں:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

ترجمہ: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور اس کے (آخری) رسول ہیں۔

اللہ کو ایک ماننے کا عقیدہ اسلام میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے جس کے بغیر کوئی انسان مسلمان نہیں ہو سکتا۔ عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز پر انسان کا یقین اتنا پختہ ہو جائے کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ انسانی زندگی میں عقیدے کی اہمیت اور اس کے اثرات کا تذکرہ توحید کے باب میں تفصیل سے ہو چکا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عقیدۂ توحید انسان کو قناعت اور بے نیازی کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو لالچ، حسد اور بزدلی سے نجات دلاتا ہے۔ اور انسان کے دل میں یہ پختہ باتیں پیدا کرتا ہے کہ صرف ایک اللہ ہی خالق و رازق ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کم دیتا ہے۔ عزت و ذلت اور حکومت و دولت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کے سوا نہ کوئی کسی کو ضرر پہنچا سکتا ہے، نہ نفع۔ وہ جس کو جو کچھ عطا کرتا ہے ایک مصلحت کے تحت اور آزمائش و امتحان کی غرض سے عطا کرتا ہے اور پھر وہ جسے جو کچھ دینا چاہتا ہے کوئی اس کو روک نہیں سکتا اور جسے کسی چیز سے محروم کرنا چاہتا ہے کوئی دوسرا اسے دے نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ ایک اللہ کو ماننے کا عقیدہ انسان کو اس کے قانون کا پابند بناتا ہے۔ یہ یقین کہ اللہ تعالیٰ انسان کے تمام چھوٹے بڑے، ظاہر و پوشیدہ اعمال سے واقف ہے، اسے غلط کاری و گناہ گاری سے محفوظ رکھتا ہے اور اسے معاشرے کا ایک مفید اور ذمہ دار شہری بناتا ہے۔

کلمۂ شہادت کا پہلا حصہ یعنی اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عقیدۂ توحید ہی کا اعلان و اعتراف ہے۔ کلمۂ شہادت کا دوسرا حصہ یعنی اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اس امر کا اعلان ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور سچے رسول ہیں اور آپؐ کا پیش کردہ دین ہی دینِ حق ہے۔ ان دونوں باتوں

کی گواہی دیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ گو بظاہر توحید و رسالت دو ہیں، لیکن دراصل دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ نہ اللہ تعالیٰ کو مانے بغیر کوئی شخص رسولؐ کو مان سکتا ہے اور نہ رسولؐ کو تسلیم کیے بغیر اللہ تعالیٰ کو پہچان سکتا ہے (چونکہ رسولؐ پر ایمان لانے کے مفہوم میں آپؐ کی بتائی ہوئی تعلیمات کو تسلیم کرنا شامل ہے) جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ و رسول کی اس طرح اطاعت کی جائے کہ دل کی تمام خواہشات شریعتِ اسلامی کے تابع ہو جائیں۔ جیسا کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا:-

"لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ"

ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے دل کی خواہشات میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں۔

انسانی عظمت کا ضامن عقیدہ

اسلامی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب مسلمانوں نے اپنے قول و عمل سے توحید و رسالت کی گواہی دی اور اپنے تمام انفرادی و اجتماعی معاملات میں شریعتِ اسلامی کی کماحقہ پیروی کا اہتمام کیا تو وہ انسانی عظمت کی بلندیوں پر جا پہنچے۔ لیکن جب یہ گواہی دلی تصدیق اور عملی اطاعت سے محروم ہو کر رہ گئی تو ہماری عزت و عظمت خاک میں مل گئی۔

نماز

اسلام ایک مکمل اور جامع نظامِ حیات ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں کو چند اعتقادات ہی دے دینے پر اکتفاء نہیں کرتا، بلکہ ان کی پوری زندگی کو ان اعتقادات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے عبادات کا ایک نظام مقرر کرتا ہے۔ جو نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے اور سب سے اہم جزو نماز کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے

ارشادات میں سے ایک ارشاد ہے:۔

أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (سورۃ الروم: 31)

ترجمہ:۔ قائم رکھو نماز اور مت ہو شرک کرنے والوں میں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہت سی احادیث، نماز کی تاکید پر مشتمل ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:۔

رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ وَعَمُودُهُ الصَّلٰوةُ،

ترجمہ: دین کی اصل بنیاد خدا اور رسول کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا ہے اور اس عمارت کا ستون نماز ہے۔

نماز کے لیے قرآن میں صلوٰۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے لفظی معنی دعا ہیں۔ مگر اصطلاحی معنوں میں نماز اس خاص طریقے سے عبادت کرنے کا نام ہے، جو ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکھایا اور اس کے متعلق ارشاد فرمایا:۔

اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ۔

ترجمہ: یعنی نماز دین کا ستون ہے۔

نماز کی تاکید

نماز چونکہ دینی تربیت کا اہم ترین حصہ ہے اس لیے ہر اُمت پر فرض رہی ہے اور تمام انبیاءؑ اپنی اُمتوں کو نماز کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ قرآن مجید میں نماز پڑھنے کی بار بار تلقین کی گئی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ نماز قائم کرنے والے فلاح پائیں گے اور اسے ترک کرنے والے ذِلّت و خواری کا شکار ہوں گے۔ ایک آیت میں مذکور ہے کہ جب عذاب کے فرشتے جہنمیوں سے عذاب پانے کی وجہ دریافت کریں گے تو وہ اپنے جہنم میں پھینکے جانے کی وجہ یہ بتائیں گے۔

لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ (سورۃ المدثر: 43)

ترجمہ: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے۔

دل و زبان سے اللہ کو معبود تسلیم کرنے کے بعد اس کے سب سے اہم حکم نماز کی ادائیگی سے اِنحراف ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کو معبود ماننے سے انکار کے برابر ہے اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ (ترمذی)

ترجمہ: جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی، اس نے کافرانہ روش اختیار کی۔

نماز قربِ خداوندی کا سب سے مؤثر وسیلہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا صَلّٰى يُنَاجِيْ رَبَّهُ (بخاری)

ترجمہ:۔ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھتا ہے تو گویا اپنے رب سے چپکے چپکے بات چیت کرتا ہے۔

اسی اہمیت کے پیشِ نظر قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

أَوَّلُ مَا سُئِلَ، سُئِلَ عَنِ الصَّلٰوةِ

ترجمہ:۔ قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

نماز کے فوائد

1 - اللہ تعالیٰ کے سامنے بندہ کی دن میں پانچ بار حاضری اس کے دل میں یہ احساس تازہ رکھتی ہے کہ وہ صرف اور صرف اللہ کا بندہ ہے بندگی کا یہ احساس، متواتر نماز پڑھنے سے، ایک مسلمان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ اور اس کی پوری زندگی تفصیلِ احکامِ الٰہی کا عملی نمونہ بن جاتی ہے۔

2 - دن میں پانچ مرتبہ قربِ الٰہی کا احساس مسلمان کو یقین دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اس کے ساتھ ہے۔ وہ کبھی خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے کا اِحساس اسے گناہ کے کاموں سے روکتا اور اس کے دل سے ہر قسم کا خوف

اور غم دور کرتا ہے۔

3 ۔ نمازوں کے درمیانی وقفے میں بھی نمازوں کے اثرات جاری و ساری رہتے ہیں نماز کے بعد گناہ کا خیال آئے تو بندہ سوچتا ہے کہ ابھی تو اپنے اللہ سے دعا کر کے آیا ہوں کہ گناہوں سے بچا، اور ابھی گناہ کا کام کروں گا، تو کچھ دیر بعد اس کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ یہ چیز مُستقلاً گناہ سے روکے رکھتی ہے۔

4 ۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے سلسلے میں پانچ بار، باہم ملنے والے افراد کے درمیان محبت و یگانگت پیدا ہوتی ہے، جس سے سب کو فائدہ پہنچتا ہے۔

5 ۔ نماز باجماعت اور بطور خاص جمعے اور عیدین کی نمازوں سے مسلمانوں میں اجتماعیت کا شعُور پیدا ہوتا ہے۔ جب مسلمان رنگ، نسل، علاقے اور طبقے کے امتیازات سے بے نیاز ہو کر شانے سے شانہ ملا کر ایک امام کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں، تو اس سے ان کے درمیان فکری وحدت کے ساتھ ساتھ عملی مساوات کا اِحساس بھی پیدا ہوتا ہے۔

6 ۔ اجتماعی شکل میں انجام پانے والے اَعمال کی کیفیات، اِنفرادی اُعمال کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہوتی ہیں۔ اِسی لیے اجتماعی نماز کا ثواب اِنفرادی نماز کے مقابلے میں ستائیس گنا ہوتا ہے۔

7 ۔ نمازیوں کو مسجد میں آتے جاتے دیکھ کر بے نمازوں کو ترغیب و تحریک ہوتی ہے اور وہ بھی نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

8 ۔ نماز میں امام کا اِتباع اور اس کی پیروی، اجتماعی نظم و ضبط کا شعُور پیدا کرتی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو نماز باجماعت کے لیے مسجد میں نہ پہنچنے والے افراد کے لیے فرمایا تھا کہ جو لوگ نماز کے لیے مسجد میں نہیں آتے۔ اگر مجھے ان کے بیوی بچّوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ان کے گھروں میں آگ لگوا دیتا۔

بے روح نمازیں

نماز کی ادائیگی کے مُتذکرہ بالا فوائد و ثمرات آج ہمیں کیوں حاصل نہیں ہوتے؟ غور فرمائیے ہم میں سے کتنے اَفراد ہیں جو نماز باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ اس کے الفاظ اور کلمات کے معنی و مفہوم سے آشنا ہیں۔ کتنے لوگ نماز میں حُضوریٔ قلب سے بہرہ مند ہیں؟ اور نماز کے اہم ترین مقصد سے بخوبی آگاہ ہیں، کہ ان کی نماز انھیں بدی و بے حیائی سے روکتی ہو، جیسا کہ ارشاد باری ہے:-

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ (سورۃ العنکبوت: 45)

ترجمہ:- بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بری بات سے۔

درحقیقت آج ہماری نمازیں بے مقصد ہیں۔ ایسے ہی جیسے کوئی پھول ہو، بغیر خوشبو کے! یا قالب ہو، بغیر روح کے۔

روزہ

روزہ بھی اسلام کا بنیادی رُکن ہے۔ اس کے لیے قرآن و حدیث میں "صَوم" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی اپنے آپ کو روکنا ہے۔ اِصطلاحِ شریعت میں روزے سے مراد "صبحِ صادق سے لے کر غروب آفتاب تک اللہ کی خوشنودی کے لیے بعض مخصوص اُمور کی سرانجام دہی اور کھانے پینے سے اپنے آپ کو روکے رکھنا" ہے جو روزے کے علاوہ دوسرے ایام میں جائز ہے۔ قرآن حکیم کے بیان کے مطابق یہ پہلی امتوں پر بھی فرض رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ○ (سورۃ البقرہ: 183)

ترجمہ:- اے ایمان والو، فرض کیا گیا تم پر روزہ، جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے اگلوں پر، تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

مذکورہ بالا آیت سے جہاں روزے کا فرض ہونا ثابت ہوتا ہے، وہاں اس کو فرض کرنے کی حکمت بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ ہے تقویٰ کا حصول، جس سے مراد پرہیزگاری اور اللہ تعالیٰ کا خوف ہے اور یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو انسان کو برائیوں سے روکتی اور نیکیوں کی طرف راغب کرتی ہے۔

ضبطِ نفس

انسان کو نیکی کے راستے، اور بُرائی کے راستے پر ڈالنے والی اہم چیز خواہشِ نفس ہے۔ خواہشات اگر اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تابع رہیں تو انسان کی اِنفرادی اور اجتماعی خوبیوں کے فروغ کا سبب بنتی ہیں۔ لیکن جب خواہشاتِ نفسانی ہدایتِ ربانی کے تابع نہیں رہتیں، تو انسان کو حیوانی سطح سے بھی گرا دیتی ہیں۔ روزے کا اصل مقصد انسان کی خواہشات کو اَحکامِ الٰہی کے تابع کرکے اسے مُتّقی بنانا ہے۔ جو شخص ہر سال، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر پورا مہینہ اپنی بُنیادی خواہشات پر قابو پانے کی مشق کامیابی سے مکمل کرے تو اسے ضبطِ نفس کی وہ قوّت حاصل ہو جاتی ہے جس سے وہ شیطان کی ہر ترغیب کا آسانی سے مقابلہ کرسکتا ہے۔

جب ایک انسان رمضان کے پُورے مہینے میں کھانے، پینے اور نفسانی خواہشات پر قابو رکھتا ہے۔ نیز دیگر اخلاقی برائیوں سے اجتناب کرتے ہوئے اپنا اکثر وقت عبادات اور نیک کاموں میں گزارتا ہے تو اس کی طبیعت میں نیکی کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے اور اُسے بدی سے نفرت ہو جاتی ہے۔ روزہ خواہشاتِ نفسانی پر قابو پانے کی تربیت کے ساتھ ساتھ انسان کی اَنانیت (خود پسندی) کا بھی مُؤثر علاج ہے۔ جب انسان روزے میں بھوک اور پیاس کی شدّت کے باوجود، کھانے پینے کی اشیاء پاس ہوتے ہُوئے بھی، کچھ کھا پی نہیں سکتا، تو اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بے چارگی کا اِحساس ہوتا ہے اور یہ احساس جب دائمی کیفیت بن جائے، تو انسان میں ہر خلافِ شریعت عمل سے رک جانے کی صلاحیّت پیدا کر دیتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے گئے روزوں سے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں" اور یہ بھی فرمایا کہ "بہت سے روزے دار ایسے ہیں کہ جن کو اپنے روزوں سے بھوک اور پیاس کی اذیت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا"۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا ہے کہ:

مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ (بخاری)

ترجمہ: اگر کوئی شخص روزہ رکھ کر بھی جھوٹ اور غلط کاریوں سے نہیں بچتا تو اس کا کھانا پینا چھڑانے سے اللہ کو کوئی دلچسپی نہیں۔

روزوں کا ثواب

جو روزے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کے مطابق ایمان اور اِحتساب کے ساتھ رکھے جائیں، ان کے ثواب کا اندازہ درج ذیل حدیثوں سے ہوگا۔

كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ يُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَّا الصَّوْمُ فَاِنَّهٗ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ۔ (مسلم)

ترجمہ:۔ آدمی کے ہر عمل کا ثواب (اللہ تعالیٰ کے یہاں) دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ہو جاتا ہے (لیکن روزے کی تو بات ہی کچھ اور ہے) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مگر روزہ تو خاص میرے لیے ہے۔ اس لیے اس کا ثواب میں اپنی مرضی سے جتنا (چاہوں گا) دوں گا۔

مَنْ فَطَّرَ فِيْهِ صَائِمًا كَانَ مَغْفِرَةً لِّذُنُوْبِهٖ وَعِتْقَ رَقَبَتِهٖ مِنَ النَّارِ وَكَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْتَقِصَ مِنْ اَجْرِهٖ شَيْءٌ (سنن ابن ماجہ۔ ترمذی)

ترجمہ:۔ جو شخص اس (رمضان) میں کسی روزے دار کو اِفطار کرائے گا اس کے گناہوں کے لیے معافی ہے اور وہ خود کو نارِ جہنم سے بچالے

گا اور اسے روزے دار جتنا ہی ثواب ملے گا۔ جب کہ اس روزے دار کے اپنے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی۔

روزے کے اجتماعی فوائد

یوں تو روزہ ایک انفرادی عبادت ہے لیکن اس کے درجِ ذیل اجتماعی فوائد بھی ہیں:

مہینہ بھر بھوکا پیاسا رہ کر انسان کو دوسرے کی بھوک پیاس کا احساس ہوتا ہے اور دل میں ناداروں کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

کم سے کم غذا پر اکتفاء کی عادت، انسان میں قناعت و ایثار کی صفات پیدا کرتی ہے۔

ایک ہی وقت میں پوری مِلّتِ اسلامیہ کا ایک عبادت میں مصروف رہنا، باہمی یگانگت کے فروغ کا سبب بنتا ہے۔ اس اعتبار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ماہِ رمضان کو مُواسات اور غمگساری کا مہینہ قرار دیا ہے۔

ایک ماہ تک دن کے بڑے حصّے میں معدے کا خالی رہنا صحت جسمانی کے لیے مفید ہوتا ہے۔

رمضان المبارک اور قرآن حکیم

ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ط (سورۃ البقرہ : 185)

ترجمہ :- مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن، ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن، سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو تو ضرور روزے رکھے اس کے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن اور رمضان کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ قرآن کے مضامین انسان کی ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ ہیں اور یہ ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی اوّلین شرط تقویٰ ہے جو انسان میں روزے کے ذریعے نشوونما پاتی ہے۔ اس لیے رمضان میں قرآن کی شب و روز تلاوت پر بڑا زور دیا گیا ہے اور اس کا بے انتہا اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے۔ اور نمازِ تراویح کی بھی یہی غرض اور مصلحت ہے۔

رمضان اور پاکستان

یوں تو رمضان المبارک پوری دُنیا کے مسلمانوں کے لیے رحمت اور مغفرت کا مہینہ ہے لیکن ہم پاکستانی مسلمانوں کے لیے اس مہینہ اور اس کی ایک مبارک شب کی خاص اہمیّت اس وجہ سے بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مبارک رات میں ہمیں آزادی عطا فرمائی تھی۔ رمضان کی ستائیسویں شب کو پاکستان کی تشکیل گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ اس مملکت میں اسی کتابِ مقدّس کا نظامِ زندگی نافذ کیا جائے، جو اس مبارک شب میں نازل ہوئی اور ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا بھی اسی غرض سے تھا کہ یہاں اسلامی نظامِ حیات نافذ کیا جائے۔ اس اعتبار سے رمضانِ المبارک، تشکیلِ پاکستان کی سالگرہ اور خدا سے کیے ہوئے ہمارے عہد کی تجدید کا بھی موقع ہے۔

بے اثر روزے

آج ہمارے روزوں کے وہ فیوض و برکات ظاہر نہیں ہوتے جن کا ہم اوپر کی سطور میں تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم روزے کے اصل مقصد تقویٰ (ضبطِ نفس) سے بے خبر ہیں۔ اس کی اہم شرائط، ایمان اور احتساب، دونوں سے غافل ہیں۔ جس طرح عام طور پر ہماری نمازیں دکھاوے کی ہیں، ویسے ہی ہمارے

روزے بھی بالعموم نمائشی ہو گئے ہیں۔

زکوٰۃ

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معاشی نظام میں زکوٰۃ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے، کہ قرآن میں اکثر مقامات پر ادائیگی نماز کے ساتھ ادائیگی زکوٰۃ کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ نماز اگر بدنی عبادت ہے تو زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ نظام زکوٰۃ کی حیثیت کے پیش نظر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے زکوٰۃ کی ادائیگی کا انکار کرنے والوں سے جہاد کیا۔ باوجودیکہ وہ کلمہ گو تھے اور فرمایا کہ میں زندگی میں ان دونوں فرائض کی تعمیل میں کوئی فرق نہیں ہونے دوں گا۔

زکوٰۃ کے لغوی معنی پاک کرنے کے ہیں۔ جو انسان زکوٰۃ ادا کرتا ہے، وہ اللہ کے حکم کے مطابق نہ صرف اپنے مال کو پاک کر لیتا ہے، بلکہ اس کے ذریعے اپنے دل کو بھی دولت کی ہوس سے پاک کرتا ہے اور دولت کے مقابلے میں اللہ کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور اسی کے حکم پر اپنی دولت کو قربان کرتا ہے۔ ادائیگی زکوٰۃ اسے یہ بھی یاد دلاتی ہے، کہ جو دولت وہ کماتا ہے وہ حقیقت میں اس کی ملکیت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے۔ یہ احساس اُسے معاشی بے راہ روی سے بچاتا اور اس کے تمام معاشی اعمال کو احکامِ الٰہی کا تابع کرتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق معاشی معاملات دین کا اہم حصہ ہیں۔ جب انسان دولت جیسی نعمت اللہ تعالیٰ کے حکم پر قربان کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے ایثار کی قدر کرتے ہوئے اس قربان شدہ مال کو اپنے ذمے قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ فرماتا ہے کہ بندے کا یہ قرض وہ کئی گنا بڑھا کر واپس کرے گا۔ ارشاد ربانی ہے:-

إِن تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ ۙ

(سورہ التغابن : 17)

ترجمہ:- اگر قرض دو اللہ کو اچھی طرح پر قرض دینا وہ دونا کرے اُس کو تمہارے لیے اور تم کو بخشے اور اللہ قدردان ہے اور تحمل والا۔

اس کے مقابلے میں جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (سورہ التوبہ : 34)

ترجمہ:- اور جو لوگ سونا اور چاندی گاڑھ کر رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو عذاب دردناک کی خبر دیجیے۔

ان آیات کی رو سے زکوٰۃ کی ادائیگی انسان کے لیے آخرت کی نعمتوں کے حصول اور عذابِ جہنم سے نجات کا ذریعہ ہے جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہو سکتی۔

معاشی فوائد

1 - سودی نظام معیشت میں محنت کے مقابلے میں چونکہ سرمایہ کی افادیت کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے محنت کش اور کارکن طبقہ مسلسل غریب سے غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور سرمایہ دار طبقہ مختلف طریقوں سے اس طبقے کی دولت ہتھیاتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح معاشی نظام مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ زکوٰۃ اس صورت حال کا بہترین حل ہے۔ نظامِ زکوٰۃ کے ذریعے دولت کا ایک دھارا امیر طبقے سے غریب طبقے کی جانب بھی مڑ جاتا ہے۔ جس سے غریب لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:-

يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ۗ (سورہ البقرہ : 276)

ترجمہ:- اللہ سود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔

ادائیگی زکوٰۃ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعے پیدا ہونے والی

کمی کو پورا کرنے کے لیے صاحبِ مال اپنی دولت کسی نہ کسی منفعت بخش کاروبار میں لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جس سے سرمایہ کاری میں اضافہ ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کی شرح کیونکہ صرف اڑھائی فیصد ہے، لہذا صاحبِ مال یہ رقم دیگر قسم کے بھاری ٹیکسوں کے مقابلے میں خوش دلی اور دیانت داری سے ادا کرتا ہے اور اپنا سرمایہ پوری آزادی سے کاروبار میں لگاتا ہے، جب کہ بھاری ٹیکسوں کی ادائیگی کے خوف سے سرمایہ چھپانے کا رجحان بڑھتا ہے، جس سے ملکی معیشت کمزور ہو جاتی ہے۔

معاشرتی فوائد

۱۔ معاشرے میں دولت کی وہی حیثیت ہے، جو انسانی جسم میں خون کی۔ اگر یہ سارا خون دل (یعنی مالدار طبقے) میں جمع ہو جائے تو پورے اعضاءِ جسم (یعنی عوام) کو مفلوج کر دینے کے ساتھ ساتھ خود دل کے لیے بھی مضر ثابت ہوگا۔ اگر ایک طرف مفلس طبقہ، ناداری کے مصائب سے دوچار ہوگا تو دوسری طرف صاحبِ ثروت طبقہ دولت کی فراوانی سے پیدا ہونے والے اخلاقی امراض (مثلاً عیاشی، آرام کوشی اور فکرِ آخرت سے غفلت شعاری) کا شکار ہو جائے گا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں ان دونوں طبقوں میں حسد اور حقارت کے علاوہ کوئی اور رشتہ باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ کشیدگی بڑھتی ہی جائے گی اور کسی نہ کسی بہانے ضرور رنگ لا کر رہے گی۔

ان تمام انفرادی و اجتماعی فوائد کے پیشِ نظر، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینے کی اسلامی ریاست کے قیام کے فوراً بعد یہ ہدایت کی گئی:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا

(سورہ التوبہ: 103)

ترجمہ:۔ ان کے مال میں سے زکوٰۃ وصول کرو کہ اس سے تم ان کو (ظاہر

میں بھی) پاک کرتے ہو اور باطن میں بھی) پاکیزہ بناتے ہو۔

زکوٰۃ کے مصارف

تقسیمِ زکوٰۃ کی مدّات بھی اللہ تعالیٰ نے خود متعین فرما دی ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ (سورہ التوبہ: 60)

ترجمہ:۔ زکوٰۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پرچانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے رستہ میں اور راہ کے مسافر کو۔ ٹھہرایا ہُوا ہے اللہ کا اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اس آیت کی رو سے مندرجہ ذیل مصارفِ زکوٰۃ معلوم ہوئے:

1۔ ان تنگ دست لوگوں کی اعانت جن کے پاس کچھ نہ ہو۔
2۔ ان لوگوں کی اعانت جو زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہوں۔
3۔ زکوٰۃ کی وصولی پر متعین عملے کی تنخواہیں۔
4۔ ان لوگوں کی اعانت جو نو مسلم ہوں، تاکہ ان کی تالیفِ قلب ہو سکے۔
5۔ غلاموں اور ان لوگوں کو آزاد کرنے کے مصارف جو قید و بند میں ہوں۔
6۔ ایسے لوگوں کے قرضوں کی ادائیگی جو نادار ہوں۔
7۔ جہاد فی سبیل اللہ اور تبلیغ دین میں جانے والوں کی اعانت میں۔
8۔ مسافر جو حالت سفر میں مالک نصاب نہ ہو، گو مکان پر دولت رکھتا ہو۔

جب اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو تو زکوٰۃ حکومت کے سپرد کر دینا لازم ہوگا تاکہ وہ اپنے طور پر بہتر طریقے سے مقررہ مدّات میں زکوٰۃ تقسیم کر سکے۔ البتہ اگر کسی خطۂ زمین

پر مسلمان غیر اسلامی حکومت کے زیر فرمان آجائیں، تو اس صورت میں ہر فرد اپنے طور پر ان مذکورہ مدات پر خرچ کر سکتا ہے۔

مسائل زکوٰۃ

زکوٰۃ ان لوگوں پر فرض ہے جن کے پاس ایک خاص مقدار میں سونا، چاندی، روپیہ یا سامان تجارت ہو۔ اس خاص مقدار کو نصاب کہتے ہیں۔ مختلف اشیاء کا نصاب یہ ہے :-

1۔ سونا ـــــ ساڑھے سات تولے

2۔ چاندی ـــــ ساڑھے باون تولے

3۔ روپیہ، پیسہ اور سامان تجارت۔ سونے چاندی دونوں میں سے کسی ایک کی قیمت کے برابر۔

زکوٰۃ کسی مال پر اس وقت واجب ہوتی ہے جب اسے جمع کیے ہوئے پورا ایک سال گذر چکا ہو۔

ادائیگی زکوٰۃ کے چند اُصول

1۔ زکوٰۃ صرف مسلمانوں ہی سے لی جاتی ہے۔

2۔ وہ عزیز و اقارب جن کی کفالت شرعاً فرض ہے۔ (مثلاً ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، شوہر، بیوی وغیرہ) انھیں زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ البتہ دور کے عزیز غیروں کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہیں۔

3۔ عام حالات میں ایک بستی کی زکوٰۃ خود اسی بستی میں تقسیم ہونی چاہیے۔ البتہ اس بستی میں مستحقین زکوٰۃ کے نہ ہونے، یا کسی دوسری بستی میں ہنگامی صورتحال مثلاً سیلاب، زلزلہ، قحط وغیرہ کے مواقع پر دوسری بستی میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

4۔ زکوٰۃ دینے والوں کو چاہیے کہ وہ ممکن حد تک یہ اطمینان کر لیں کہ زکوٰۃ لینے والا

اس کا مستحق ہے۔

5۔ زکوٰۃ کی رقم سے ضرورت کی اشیاء خرید کر بھی مستحقین کو دی جاسکتی ہیں۔

6۔ مستحق زکوٰۃ کو بتانا ضروری نہیں کہ پیسہ یا مال زکوٰۃ کا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! ہمارے ملک میں نظامِ زکوٰۃ کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کی کامیابی کے لیے ہر ممکن تعاون کریں۔ تاکہ اس کی برکت سے ہمارا معاشرہ دُنیا کے لیے مشعل راہ بن سکے۔

زکوٰۃ کے جملہ فوائد و ثمرات تب ہی ظاہر ہو سکتے ہیں، جب ہر صاحبِ مال اللہ جل شانہ کی خوشنودی کو اپنا لائحۂ عمل بنائے اور اسلام کے فیض رسانی اور نفع بخشی کے جذبہ کو ملحوظ خاطر رکھے خصوصاً زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا نظامِ اجتماعی طور پر قائم و دائم ہو۔

حج

ارکانِ اِسلام میں حج کی اہمیت کا اندازہ قرآن مجید کی اس آیت کریمہ سے بخوبی ہوتا ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ط وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (سورہ آل عمران : 97)

ترجمہ:۔ اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر، حج کرنا اس گھر کا، جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کی طرف راہ چلنے کی، اور جو نہ مانے تو پھر اللہ پروا نہیں رکھتا جہان کے لوگوں کی۔

حج کی غرض و غایت چند خاص مقامات کی صرف زیارت ہی نہیں، بلکہ اس کی پشت پر ایثار، قربانی، محبّت اور خلوص کی ایک درخشاں تاریخ موجود ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ جیسی عظیم ہستیوں کے خلوص و عزیمت کی بے مثال داستان ہے۔ اللہ نے 86 سال کی عمر میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو ایک بیٹا دیا۔ اس کا نام اسماعیل (علیہ السلام) رکھا گیا۔ کچھ عرصے بعد اس اکلوتے بیٹے کو اس کی ماں کے ساتھ ایک غیر آباد اور ویران وادی میں چھوڑ آنے کا حکم دیا گیا جس پر خود انھوں نے بھی بڑے صبر و حوصلہ سے عمل کیا اور حضرت ہاجرہ نے بھی اس سلسلے میں بڑی عزیمت کا مظاہرہ کیا۔ جب یہ بچّہ کچھ بڑا ہوا اور دوڑ دھوپ کے قابل ہو گیا تو اسے قربان کرنے کا حکم دیا گیا۔ اللہ کے اس عظیم بندے ابراہیم علیہ السلام نے اس پر بھی بڑی استقامت سے عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں اس قربانی کو شرف قبولیت عطا فرمایا، وہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی بچا لیا۔ جنھوں نے تسلیم و رضا کی عظیم الشان مثال پیش فرمائی تھی۔ حج کے متعدد مناسک ہمیں انھیں عظیم اور بزرگ ہستیوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔

حج ایک جامع عبادت ہے اور اس کا سب سے بڑا فائدہ گناہوں کی بخشش ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:۔

ترجمہ:۔ جو کوئی خالصتاً اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں حج کرتا ہے اور دوران حج فسق و فجور سے باز رہتا ہے وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو کر لوٹتا ہے گویا ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔

اپنے گناہ گار بندوں کو دُنیا ہی میں پاک صاف کر دینے کا یہ انتظام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی دلیل ہے۔ لہٰذا اس سے فائدہ نہ اُٹھانا حد درجہ کی ناشکری اور بدبختی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

ترجمہ:۔ جس (صاحبِ استطاعت) شخص کو نہ کوئی ظاہری ضرورت حج سے روک رہی ہو، نہ کوئی ظالم بادشاہ اس کی راہ میں حائل ہو اور نہ کوئی روکنے والی بیماری اسے لاحق ہو اور پھر بھی وہ حج کیے بغیر مر جائے تو وہ خواہ کسی یہودی کی موت مرے یا نصرانی کی۔

جامعیت

حج جیسی جامع عبادت میں تمام عبادات کی روح شامل ہے۔ حج کے لیے روانگی سے واپسی تک دورانِ سفر نماز کے ذریعے قربِ الٰہی میسّر آتا ہے۔ حج کے لیے مال خرچ کرنا زکوٰۃ سے مشابہت رکھتا ہے۔ نفسانی خواہشات اور اخلاقی برائیوں سے پرہیز اپنے اندر روزے کی سی کیفیت رکھتا ہے۔ گھر سے دوری اور سفر کی صعوبت میں جہاد کا رنگ ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسُول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "سب سے افضل جہاد حج مبرور

(مقبول) ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسی ارشاد گرامی کے پیش نظر حضرت عمرؓ فرمایا کرتے۔ "حج کا سامان تیار رکھو کہ یہ بھی ایک جہاد ہے"۔

زائرین خانہ کعبہ کی کیفیات

اگر حج کے مناسک پر غور کیا جائے، تو معلوم ہو گا کہ ہر مرحلہ اپنے اندر اخلاقی و روحانی تربیت کا سامان رکھتا ہے۔ جب ایک شخص اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر اور دنیوی دلچسپیوں سے منہ موڑ کر، دو ان سلی چادریں اوڑھ کر "لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ" کی صدائیں بلند کرتے ہوئے بیت اللہ شریف میں حاضر ہوتا ہے تو اس کا یہ سفر ایک طرح سے سفرِ آخرت کا نمونہ بن جاتا ہے۔

اس دینی ماحول اور پاکیزہ فضا میں جب وہ مناسک حج ادا کرتا ہے تو اس کی حالت ہی عجیب ہوتی ہے۔ میدان عرفات کے قیام میں اسے وہ بشارت یاد آتی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی صورت میں مسلمانوں پر اپنی نعمت تمام فرمائی ہے۔ اسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک خطبے کی بے مثال ہدایات یاد آتی ہیں۔ اسے یہ حکم یاد آتا ہے کہ "میرے بعد گمراہی سے بچنے کے لیے قرآن اور حدیث کو مضبوطی سے تھامے رہنا"۔ قربانی کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ کی بے نظیر قربانی یاد آتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس قربانی کے مقابلے میں میرے نفس کی چھوٹی موٹی خواہشات کی قربانی کی حقیقت ہی کیا ہے؟ میرا تو مرنا جینا بھی اللہ ہی کے لیے ہونا چاہیے۔ ایسے میں اس کے قلب و ذہن پر یہ کلمات بیساختہ جاری ہو جاتے ہیں۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (سورۃ الانعام : 163، 164)

ترجمہ:۔ کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو پالنے والا سارے جہان کا ہے۔ کوئی نہیں اس کا شریک

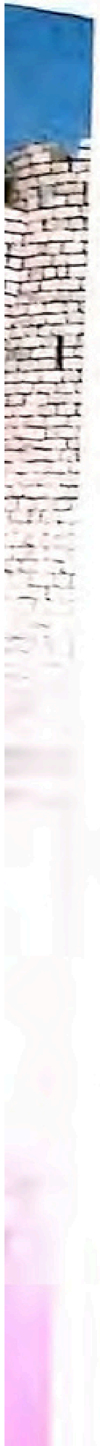

اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں۔

مقام منیٰ میں وہ اس عزم کے ساتھ اپنے ازلی دشمن شیطان کو کنکریاں مارتا ہے کہ اب اگر یہ میرے اور میرے اللہ کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کرے گا تو اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کروں گا۔ جب وہ بیت اللہ کے سامنے پہنچتا ہے تو اس کی روح اس خیال سے وجد میں آجاتی ہے کہ جس مقدس گھر کی زیارت کے لیے آنکھیں نمناک تھیں، دل مضطرب تھا وہ آج نظر کے سامنے ہے۔ اللہ سے لو لگائے رکھنے کی یہ کیفیت حاجی کے لیے تسکینِ قلب اور روح کی مسرت کا باعث بنتی ہے طواف کے بعد وہ صَفا اور مَروَہ کے درمیان سَعی کرتا ہے۔ تو گویا زبان حال سے کہتا ہے کہ اے اللہ! تیرے قرب سے حاصل ہونے والی اس قوتِ ایمانی کو میں تیرے دین کی سربلندی کے لیے وقف کر دوں گا اور عمر بھر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کروں گا۔ دل کی یہی تمنا دعا بن کر اس طرح لبوں تک آتی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اسْتَعْمِلْنِیْ بِسُنَّةِ نَبِیِّكَ وَتَوَفَّنِیْ عَلٰی مِلَّتِهٖ وَاَعِذْنِیْ مِنْ مُضِلَّاتِ النَّفْسِ۔

ترجمہ:۔ اے میرے اللہ! مجھے اپنے نبیؐ کے طریقے پر کاربند رکھ اور اس پر عمل کرتے ہوئے مجھے اپنے پاس بلا لے۔ اور نفسانی لغزشوں سے مجھے محفوظ فرما دے۔

فوائد

1- حج کا اصل فائدہ یادِ الٰہی اور قربِ ربانی ہے لیکن دیگر ارکانِ دین کی طرح اس کے بھی متعدد معاشرتی و اخلاقی فوائد ہیں۔ اس موقع پر دُنیا کے مختلف علاقوں سے آنے والے افراد فریضۂ حج کی ادائیگی کی بدولت گناہوں سے پاک صاف ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ ایمان اور تقویٰ کی پاکیزگی کی جو دولت

لے کر لوٹتے ہیں وہ ان کے ماحول کی بھی اِصلاح کا سبب بن جاتی ہے۔

2 - حج کا یہ عظیم الشان اجتماع ملّت اسلامیہ کی شان و شوکت کا آئینہ دار ہوتا ہے جب دُنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مسلمان رنگ و نسل، قوم و وطن کے امتیازات سے بلند و بالا ہو کر یک زبان ایک ہی کلِمہ "لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ" دُھراتے ہیں، ایک ہی کیفیت میں سرشار اپنے پروردگار کی پکار پر لپکے جا رہے ہوتے ہیں، تو گویا وہ اللہ کے فداکار سپاہیوں کی ایک فوج معلوم ہوتے ہیں۔

3 - حج کا ایک اہم تجارتی اور اقتصادی فائدہ بھی ہے کہ مختلف ممالک سے آنے والے حُجّاج خرید و فروخت کے ذریعے معاشی نفع حاصل کرتے ہیں۔

حجِ مقبول

حج کے مذکورہ بالا اِجتماعی و انفرادی فوائد سے ہم اسی صورت میں فیضاب ہو سکتے ہیں۔ جب ہمارا مقصد رضائے الٰہی ہو۔ ہماری سرگرمیوں کا مرکز و محور دینِ حق کی سربلندی ہو اور حج کے روحانی مقاصد پر نظر جمی رہے۔ تب ہی ہمارا حج، حجِ مقبول و مَبرُور ہو سکتا ہے۔

جہاد

جہاد کا مفہوم

جہاد کے لغوی معنی کوشش کے ہیں اور دینی اِصطلاح میں اس سے مراد وہ کوشش ہے جو دین کی حفاظت، فروغ اور اُمتِ مُسلمہ کے دفاع کے لیے کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کو اس دُنیا کا حاکم مان لینے کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنی زندگی کے جُملہ معاملات میں اس کے احکام کی پیروی کرے۔ نیز اس کے مقابلے میں کسی اور کا حکم نہ چلنے دے۔ اگر کوئی طاقت "اقتدارِ اعلیٰ" اپنے ہاتھ میں لے کر اپنا قانون نافذ کرنا چاہے، تو وہ جان پر کھیل کر اس کا مقابلہ کرے۔ اسلام کی جملہ عبادات انسان میں یہی جذبۂ فداکاری پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس جذبے کے بغیر نہ اسلام کی بقاء ممکن ہے، نہ فروغ۔

اقسامِ جہاد

جہاد کی کئی اقسام ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:-

خواہشِ نفس کے خلاف جہاد: انسان کو اِطاعتِ الٰہی سے روکنے والی پہلی قوت اِنسان کی اپنی خواہشات ہیں۔ جو ہر وقت اس کے دل میں موجزن رہتی ہیں۔ انسان کو ان کی سرکوبی کے لیے ہر وقت چوکنا رہنا چاہیے۔ لہٰذا خواہشاتِ نفس کے خلاف جہاد کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "جہادِ اکبر" کا نام دیا ہے اور یہ جہاد کا وہ مرحلہ ہے جسے طے کیے بغیر انسان جہاد کے کسی اور میدان میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

شیطان کے خلاف جہاد: اپنے نفس پر قابو پا لینے کے بعد ان شیطانوں سے نمٹنا ضروری ہوتا ہے جو اللہ کے بندوں کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے

بلا کر اپنی اطاعت اور بندگی پر مجبور کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم اس قسم کی ہر قوت کو "طاغوت" کا نام دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (سورہ النسآء : 76)

ترجمہ :- جو لوگ ایمان والے ہیں سو لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو کافر ہیں سو لڑتے ہیں شیطان کی راہ میں۔

یہ طاغوتی قوتیں مسلمان معاشرے کے اندر غلط رسم و رواج کی شکل میں بھی پائی جاتی ہیں اور اسلامی معاشرے کے باہر غیر اسلامی ممالک کے غلبے کی شکل میں بھی۔ چنانچہ ان طاغوتی طاقتوں سے نمٹنے کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ کہیں ان سے زبان و قلم کے ذریعے نمٹا جاتا ہے، اور کہیں قوت و طاقت کے ذریعے۔ اس بارے میں قرآن مجید ایک جامع ہدایت دیتا ہے۔

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط (سورہ النحل : 125)

ترجمہ :- اور ان سے ایسے انداز میں بحث و تمحیص کرو جو بہت اچھا ہو۔

اگر جہاد کا سچا جذبہ دل میں موجزن ہو تو مومنانہ بصیرت ہر موقع پر مناسب راہیں سُجھا دیتی ہے۔ اس سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان بہترین رہنمائی کرتا ہے۔

مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ (مسلم)

ترجمہ :- تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو اُس کو چاہیے کہ اسے ہاتھ سے (قوت سے) روکے۔ اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اور اگر اس کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو اسے دل سے برا سمجھے اور یہ (بدی کو محض دل سے برا سمجھنا) ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

جہاد بالسیف

حق و باطل کی کش مکش میں وہ مقام آکر رہتا ہے۔ جب طاغوتی قوتیں حق کا راستہ روکنے اور اسے مٹانے کے لیے سرد جنگ سے آگے بڑھ کر کھلی جنگ پر اُتر آتی ہیں اور مسلمانوں کو ملّی تحفظ اور بقائے دین کے لیے ان سے نبردآزما ہونا پڑتا ہے۔ اس کی دو اَقسام ہیں :-

اوّل۔ مُدافعانہ جہاد : اگر کوئی غیر مسلم قوت کسی مسلمان ملک پر حملہ کر دے تو اس ملک کے مسلمانوں پر اپنے دین و ایمان، جان و مال اور عزّت و آبرو کے تحفظ کی خاطر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ مسلمان ممالک اور اسلامی معاشرے کو غیر مسلموں کے تسلّط سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں جو بھی کوشش کی جائے گی، وہ جہاد شمار ہو گی۔ مدافعانہ جہاد کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ اگر کسی غیر مسلم ریاست کی مسلمان رعایا پر محض اس کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ظلم و ستم ڈھایا جا رہا ہو تو عالمِ اسلام اسے ظلم و ستم سے نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

دوم مصلحانہ جہاد : جو شخص کلمہ طیبہ پڑھ کر اللہ کی حاکمیت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اِطاعت کا اِقرار کرتا ہے، اس پر لازم آتا ہے کہ وہ ساری دُنیا میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت نافذ کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد دینِ حق کا قیام بتایا ہے :-

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ ۝ (سورہ التوبہ : 33)

ترجمہ :- اس نے بھیجا اپنے رسُول کو ہدایت اور سچّا دین دے کر تا کہ اس کو غلبہ دے ہر دین پر اور پڑے برا مانیں مشرک۔

مزید برآں ارشاد خداوندی ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ج

(سورہ الانفال : 39)

ترجمہ:- اور لڑتے رہو ان سے، یہاں تک کہ نہ رہے فساد، اور ہو جاوے حکم سب اللہ کا۔

جہاد اور جنگ میں فرق

مُخالفینِ اِسلام ہمارے دین کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ دین تلوار کے زور سے پھیلا، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ مسلمان کی تلوار اور کافر کی شمشیر، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کافر کی جنگ کا مقصد کسی مخصوص فرد، گروہ یا قوم کی ہوسِ مُلک گیری، جذبۂ برتری یا مُعاشی غلبے کے جذبے کی تسکین ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ہر ممکن ظُلم، دہشت گردی اور سفاکی سے کام لیتا ہے اور کامیاب ہو جانے کی صورت میں مفتوحین کی جان و مال اور عزت و آبرو غرض کہ ہر چیز کو غارت کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان کے جہاد کا مقصد انسانوں کو طاغُوتی قُوتوں کے غلبے سے نجات دلانا، ان کے شرف اور ان کی آزادی کو بحال کرنا ہے اس مقصد کے لیے وہ خود کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ضابطۂ جہاد کا پابند رکھتا ہے جس میں اس کی ذاتی منفعت کا شائبہ تک شامل نہیں ہوتا۔ اس کی تلوار کی زَد محض برسرِ جنگ افراد تک محدود رہتی ہے اور پھر جب وہ فتح حاصل کرتا ہے تو مفتُوح قوم کو اپنے جذبۂ انتقام کا نشانہ بنانے کے بجائے ان کے لیے اَمن و سلامتی کی فضا فراہم کرتا ہے اور انھیں اِسلام کی برکات سے بہرہ ور کرتا ہے، جس کے تحت تمام انسانوں کے حقُوق یکساں ہیں۔ چنانچہ جب غیر مُسلم رعایا کو مسلمانوں کا نظامِ عدل، نظامِ اخلاق، نظامِ سیاست و حکومت اور نظامِ عبادات پسند آجاتا ہے، تو وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے ہیں، اور ان کی اس ذہنی تبدیلی کا سہرا تلوار کے سر نہیں۔ بلکہ اِسلامی تعلیمات اور مجاہدینِ اسلام کے اعلیٰ کردار کے سر ہے۔ تلوار کا کام تو صرف اتنا ہے کہ اسلام کے عادلانہ

نظام اور عالمِ اسلام کے درمیان جو لادینی قُوتیں رکاوٹ بنی ہوئی ہوں ان کا صفایا کر دے۔

جہاد کے فضائل

قرآنِ حکیم اور احادیث میں جہاد کے متعدد فضائل بیان ہوئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ

(سورہ الصف : 4)

ترجمہ:- بے شک اللہ پسند کرتا ہے ان لوگوں کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار باندھ کر۔ گویا وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔

حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "قسم ہے اللہ کی جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے ایک صبح یا ایک شام کا سفر دنیا و مافیہا کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے، اور اللہ کی راہ میں دشمن کے مقابل اگر ٹھہرے رہنے کا ثواب گھر میں ستر نمازوں سے زیادہ ہے"۔ بلاشبہ یہ جہاد کی عظمت و فضیلت اور شہادت کی تڑپ ہی کا جذبہ تھا کہ قُرونِ اُولیٰ کے مسلمان دنیا پر چھائے رہے اور دُشمنانِ اِسلام کے دلوں پر ان کی عظمت و شوکت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

اللہ تعالیٰ اور رسولؐ اللہ کی مُحبّت واطاعت

اللہ تعالیٰ کے احسانات

اللہ تعالیٰ نے ہمیں صرف زندگی ہی نہیں دی، بلکہ زندگی بسر کرنے کے تمام لوازم بھی عطا فرمائے ہیں۔ اس کی عنایتوں کا شمار اور اس کے کرم کا حساب ممکن نہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ (سورہ ابراہیم : 34)

ترجمہ:- اور اگر تم اللہ کے اِحسانات گنو گے تو شمار نہیں کر سکو گے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ نعمتوں کی یہ کثرت و فراوانی انسان کے دل میں اپنے رحیم و کریم آقا کے لیے وہ جذبۂ محبت و احسان مندی نہ پیدا کرے جس کے بارے میں قرآن حکیم کہتا ہے :

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (سورہ البقرہ : 165)

ترجمہ : اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، انھیں اللہ کے ساتھ زیادہ شدید محبت ہے۔

رسول اللہ کے اِحسانات

اللہ تعالیٰ کے بعد ہماری محبت کے مُستحق اس کے رسول مُحمّد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔ آپؐ کی ذاتِ بابرکات کے ذریعے ہمیں اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت دولتِ دین میسّر آئی۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ "اللہ کی راہ میں جس قدر تکالیف مجھے دی گئیں کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں" اور وہ سب تکالیف آپؐ نے اس غرض سے برداشت کیں کہ اُمت آخرت کی تکالیف سے بچ جائے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ

وآلہٖ وسلم کی محبت کے بارے میں ارشادِ نبویؐ ہے :-

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۔

ترجمہ:- تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ میں اُسے اپنے والدین، اپنی اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

شرطِ محبّت۔ اطاعتِ رسُولؐ

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پہ اطاعتِ رسُول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے :-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (سورہ آل عمران، 31)

ترجمہ:- تو کہہ : اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری پیروی کرو (اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ) خود اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

اطاعت کی یہ شرط کچھ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے، جتنے انبیاء دُنیا میں بھیجے گئے ان کی بعثت کا بُنیادی مقصد یہ تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام پر ان کی پیروی کے ذریعے عمل پیرا ہو سکے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (سورہ النساء : 64)

ترجمہ:- اور ہم نے کوئی رسُول نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ اس کا حکم مانا جائے اللہ کے فرمانے سے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حوضِ کوثر پر ایسے لوگوں کو حضورِ اکرمؐ کے دیدار سے محرومِ کر دیا جائے گا، جنھوں نے مسلمان ہوتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیروی کرنے کے بجائے دین میں نئی نئی باتیں نکال لی تھیں۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے

كُلُّ اُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى قِيْلَ وَمَنْ اَبٰى ؟ قَالَ مَنْ اَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰى -

ترجمہ :- میرا ہر اُمتی جنت میں جائے گا۔ سوائے اس کے جو انکار کرے۔ عرض کیا گیا کہ انکار کرنے والا شخص کون ہوگا ؟ ارشاد فرمایا جو شخص میری اطاعت کرے گا وہ جنت میں جائے گا اور جو میری نافرمانی کرے گا وہ انکار کرنے والا ہوگا۔

حقوق العباد

مُعاشرتی زندگی میں اگر سب لوگوں کو ان کے جائز حقوق ملتے رہیں، تو وہ سکون و اطمینان کے ساتھ اپنی صلاحیتیں معاشرے کی ترقی کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح ماحول خوشگوار بن سکتا ہے، جسے حُسنِ معاشرت کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس آپس میں ایک دوسرے کا حق مارنے کی روش، بے چینی اور کشمکش پیدا کرتی ہے۔ اس سے معاشرے کا نظم بگڑتا ہے اور تخریبی رجحانات تعمیری صلاحیتیں کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں بھی انسان کو اپنی ہدایات سے محروم نہیں رکھا۔ اس نے انسانوں کے درمیان حقوق کا واضح تعین کر کے ان کی ادائیگی کو اپنی خوشنودی اور ادا نہ کرنے کو اپنی ناخوشی کا سزاوار ٹھہرایا۔ چنانچہ ایک سچا مسلمان حقوقُ العباد کو بھی حقوقُ اللہ ہی کی طرح محترم سمجھتا اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔

والدین کے حقُوق

مُعاشرے میں انسان کو جن ہستیوں سے سب سے زیادہ مدد ملتی ہے وہ والدین ہیں۔ جو محض اس کے وجود میں لانے کا ذریعہ ہی نہیں ہوتے، بلکہ اس کی پرورش اور تربیت کا بھی سامان ہوتے ہیں۔ دُنیا میں صرف والدین ہی کی ذات ہے جو اپنی راحت اولاد کی راحت پر قربان کر دیتی ہے۔ ان کی شفقت، اولاد کے لیے رحمت باری کا وہ سائبان ثابت ہوتی ہے، جو انھیں مشکلاتِ زمانہ کی دھوپ سے بچا کر پروان چڑھاتی ہے۔ انسانیت کا وجود اللہ تعالیٰ کے بعد والدین ہی کا مرہُونِ منت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اپنے بعد انہی کا حق ادا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ
الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ○
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ○

(سورہ الاسراء : 22 ، 23)

ترجمہ : اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اس کے سوائے ۔ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو ۔ اگر پہنچ جائیں تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں سے ، یا دونوں ، تو نہ کہہ ان کو " ہوں ! " اور نہ جھڑک ان کو ۔ اور کہہ ان سے بات ادب کی ۔ اور جھکا دے ان کے آگے کندھے عاجزی کر کے نیازمندی سے ، اور کہہ اے رب ، ان پر رحم کر ، جیسا پالا انھوں نے مجھ کو چھوٹا سا ۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ والدین کا نافرمان شخص جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بوڑھے والدین کی خدمت پر بہت زور دیا ہے ، کیونکہ وہ اپنی زندگی کی صلاحیتیں اور توانائیاں اولاد پر صرف کر چکے ہوتے ہیں ۔ اس لیے اولاد کا فرض ہے کہ ان کے بڑھاپے کا سہارا بن کر احسان شناسی کا ثبوت دے ۔ ایک بار آپؐ نے صحابہ کرامؓ کی محفل میں ارشاد فرمایا : " ذلیل وخوار ہوا ۔ ذلیل وخوار ہوا ۔ ذلیل وخوار ہوا ۔ " صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا ۔ " کون ؟ یا رسُولَ اللہ ! " ارشاد فرمایا " وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا ، پھر ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کی ۔ "

اولاد کے حقوق

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ایک زمانے میں انسان کی سنگ دلی اس درجے کو پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر ڈالتا تھا ۔ اسلام نے انسان کے دل میں سوئے ہوئے جذبۂ رحم و

اُلفت کو جگایا اور دُنیا سے قتلِ اولاد کی سنگدلانہ رسم کا خاتمہ کیا ۔ اور اولاد کو اپنے والدین سے محبت وشفقت کی نعمت ایک بار پھر ملی ۔ قرآن حکیم میں معاشرے کی دیگر برائیوں کے ساتھ قتلِ اولاد سے بھی اِن الفاظ میں منع فرمایا ۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ
قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ○ (سورہ الاسراء : 31)

ترجمہ : ۔ اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے ۔ ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو بے شک ان کا مارنا بڑی خطا ہے ۔

ایک صحابیؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسُول اللہ ! سب سے بڑا گناہ کون سا ہے ؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا " شرک " انھوں نے دریافت کیا " اس کے بعد " آپؐ نے فرمایا ۔ " والدین کی نافرمانی " عرض کیا " اس کے بعد " ارشاد ہوا " تم اپنی اولاد کو اس خوف سے مار ڈالو کہ وہ تمھارے کھانے میں حصہ بٹائے گی ۔ "

تعلیماتِ اسلامی کے تحت والدین پر اولاد کے متعدد حقوق عائد ہوتے ہیں ۔ مثلاً ۔

1 ۔ زندگی کا حق ۔
2 ۔ بنیادی ضروریات کی فراہمی ، یعنی کھانے پینے ، رہائش اور علاج کا حق ۔
3 ۔ حسبِ مقدور تعلیم وتربیت کا حق ۔

اگر والدین یہ جملہ حقوق بحسن وخوبی ادا کرتے رہیں ، تو نہ صرف یہ کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے ، بلکہ ان کی اولاد ان کے بڑھاپے کا سہارا بنتی ہے ۔ اس کے برعکس جو لوگ اولاد کے حقوق کی ادائیگی پر اپنے آرام وآسائش کو مقدم رکھتے ہیں ، ان کی اولاد ان کی آخری عمر میں انھیں بے سہارا چھوڑ دیتی ہے ۔ والدین کا فرض ہے کہ جہاں اپنی اولاد کو روزی کمانے کے قابل بنانے کی تدبیر کرتے رہیں ، وہاں ان میں فکرِ آخرت بھی پیدا کریں اور عملِ صالح کی تربیت دیں ۔ اللہ تعالیٰ

نے والدین کی ذمہ داری کو بڑے بلیغ انداز میں بیان فرمایا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (سورہ التحریم : ۶)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے۔

بلاشبہ اگر والدین خدا اور رسُول کے حکم کے مطابق اپنی اولاد کے حقوق بطریقِ اَحسن ادا کریں اور اسے نیکی کی راہ پر لگائیں، تو نہ صرف یہ کہ وہ دُنیا میں ان کی راحت کا سامان بنے گی، بلکہ آخرت میں بھی ان کی بخشش کا ذریعہ ہو گی۔

میاں بیوی کے باہمی حقُوق

مُعاشرے کی بُنیادی اِکائی گھر ہے، اور گھر کے سکون اُور خوشحالی کا اِنحصار میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات پر ہے۔ اس کی عمدگی محض دو افراد ہی کی نہیں، بلکہ دو خاندانوں اور اس کے نتیجے میں پورے معاشرے کی شادمانیوں کا سبب بنتی ہے۔ اگر ان کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو یہ صورتِ حال بہت سے رشتوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زوجین کے حقُوق کا تعین فرماتے ہوئے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے :۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ

(سورہ البقر : 228)

ترجمہ:۔ اور عورتوں کا بھی حق ہے۔ جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے۔ دستور کے موافق، اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت ہے۔

لیکن یہ درجہ محض گھر کا انتظام ایک زیادہ باہمت، حوصلہ مند اور قوی شخصیت کے سپُرد کرنے کے لیے ہے، عورتوں پر ظلم روا رکھنے کے لیے نہیں۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے خواتین کا شرف بحال کیا اور مردوں کو ان پر حکومت کا اختیار دینے کی بجائے ان کی حفاظت کی ذمہ داری سپُرد کی اور تلقین کی کہ بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک

کو خیر اور اچھائی کا معیار بتایا۔ ارشاد فرمایا :

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ

ترجمہ :۔ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا ہے۔

ایک بار ایک صحابیؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا۔ یا رسُول اللہؐ! بیوی کا اپنے شوہر پر کیا حق ہے؟" آپؐ نے ارشاد فرمایا "جو خود کھائے اسے کھلائے۔ جیسا خود پہنے، ویسا اسے پہنائے۔ نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے، نہ اسے بُرا بھلا کہے" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بیویوں کے حقوق کا اتنا خیال تھا کہ خطبۂ حجۃُ الوداع میں ان سے حُسنِ سلوک کی تلقین فرمائی۔ دوسری جانب اللہ تعالیٰ نے نیک بیویوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا :۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ (سورہ النساء : 34)

ترجمہ :۔ پس جو عورتیں نیک ہیں، فرمانبردار ہیں، نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے۔

جہاں مرد کو مُنتظمِ اَعلیٰ کی حیثیت سے بیوی بچّوں کی کفالت اور حفاظت کی ذمّہ داری سونپی گئی۔ وہاں عورتوں کو پابند کیا گیا کہ وہ مردوں کی وفادار اور اِطاعت گزار بن کر رہیں۔ ایک مسلمان بیوی کے لیے شوہر کی جو حیثیت ہوتی ہے، اس کا اندازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے ہوتا ہے "اگر میں خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدے کا حکم دیتا تو بیوی سے کہتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے"۔ شوہر کو بھی نصیحت کی گئی ہے کہ اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بیوی پر سختی نہ کرے، بلکہ اگر اس میں کچھ خامیاں بھی پائی جاتی ہوں تو درگزر کرے اور اس کی خوبیوں کی قدر کرے۔ اس بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○ (سورہ النساء : 19)

ترجمہ: اور گزران کرو عورتوں کے ساتھ اچھی طرح۔ پھر اگر وہ تم کو نہ بھاویں۔ تو شاید تم کو پسند نہ آوے ایک چیز اور اللہ نے رکھی ہو اس

میں بہت خوبی۔

اس بات کی تشریح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث مبارک سے ہوتی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اپنی بیویوں میں کوئی برائی دیکھ کر ان سے نفرت نہ کرنے لگ جاؤ۔ اگر تم غور کرو گے تو تمھیں ان میں کوئی اچھائی بھی ضرور نظر آجائے گی"

ترجمہ: اور عورتوں کو اُن کے مہر خوشی سے دیا کرو اور اگر وہ اپنی خوشی سے اس سے کچھ تمہیں چھوڑ دیں تو اسے ذوق و شوق سے کھالو۔ (النساء:4)

ترجمہ: جو مال ماں باپ اور رشتے دار چھوڑ کر مریں تھوڑا ہو یا بہت ۔ اس میں مردوں کا بھی حصّہ ہے اور عورتوں کا بھی۔ یہ حصّے خُدا کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ (النساء:7)

رشتہ داروں کے حقُوق

والدین اور اُولاد اور شریکِ حیات (بیوی) کے حقوُق کے بعد اِسلام رشتہ داروں کے حقُوق پر زور دیتا ہے۔ کیونکہ معاشرتی زندگی میں انسان کا واسطہ اہلِ خانہ کے بعد سب سے زیادہ انہی سے پڑتا ہے۔ اگر خاندان کے افراد ایک دوسرے کے حقُوق اچھے طریقے سے ادا کرتے رہیں تو پورے خاندان میں محبت اور اپنائیت کی فضا قائم ہوگی، اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو نفرت اور دوری پیدا ہوجائے گی، اور آئے دن کے جھگڑوں سے خاندان کا سکون برباد ہوکر رہ جائے گا۔ اور پورا معاشرہ اس سے محروم ہوجائے گا۔ قرآن اور حدیث دونوں میں صلۂ رحمی یعنی رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کی بار بار تلقین کی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (سورہ الاسراء : 26)

ترجمہ:۔ رشتہ دار کو اس کا حق دو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ

ترجمہ:۔ رشتہ داروں سے تعلق توڑنے والا جنّت میں داخل نہیں ہوگا۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے ضرورت مند رشتہ داروں کی ضروریات کا خیال رکھیں، تاکہ انھیں غیروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ تلقین کی گئی ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اس میں ترجیح اپنے رشتہ داروں کو دو اور پھر ان کے ساتھ جو سلوک کرو اس پر انھیں طعنے دے کر اپنے اجر و ثواب کو برباد نہ کرو۔ انھیں احساسِ تنہائی اور احساسِ کمتری کا شکار نہ ہونے دو۔ ان کی شادی، غمی میں شریک ہو۔ رشتے داروں کے ذریعے امداد کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوتی اور مقصد پورا ہوجاتا ہے۔ جب کہ غیروں سے مدد طلب کرنے میں اپنی ہی نہیں، خاندان کی عزت بھی گھٹتی ہے۔ اگر ہم میں سے ہر شخص اللہ اور رسولؐ کی ہدایات کے مطابق اپنے رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھے تو معاشرہ بہت سی خرابیوں سے محفوظ رہے گا۔

اساتذہ کے حقُوق

اسلام نے جہاں مسلمانوں پر حصُولِ علم کو فرض قرار دیا، وہاں اُستاد کو بھی ایک باعزت مقام عطا کیا۔ تاکہ اس کی وجاہت سے علم کا وقار بڑھے اور علم سے انسانیت کا۔ استاد کا یہ اعزاز کیا کم ہے کہ اسے اس پیشے کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک خصوصی نسبت حاصل ہے۔ جیسا کہ ارشادِ رسُول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا

ترجمہ:۔ مجھے تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے۔

استاد علم دے کر نئی نسل کی صحیح نشوونما اور اس کے فکر و نظر کی اصلاح کرتے ہیں۔ نئی نسل انہی کے فراہم کردہ سانچوں میں ڈھلتی ہے۔ استاد کے اعزاز و احترام کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "تیرے تین باپ ہیں، ایک وہ جو تجھے عدم سے وجود میں لایا، دوسرا وہ جس نے تجھے اپنی بیٹی دی، تیسرا وہ جس نے تجھے علم کی دولت سے مالا مال کیا۔"

مُعلّم کی حیثیت علم کی بارش کی سی ہوتی ہے۔ اور طلبہ کی حیثیت زمین کی جو زمین بارش کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہ بارش کے فیض سے سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے اسی طرح جو شاگرد اپنے استادوں کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتا ہے، وہ علم کے ثمرات سے مستفید ہوتا ہے۔ یہ حوصلہ اور ظرف بھی، والدین کے علاوہ صرف استاد ہی کا ہوتا ہے، کہ وہ اپنے شاگرد کو خود سے آگے بڑھتے دیکھ کر حسد کرنے کی بجائے خوش ہوتا ہے، کیونکہ حقیقت میں وہ اپنے طلبہ کی کامیابیوں کو اپنی ہی کامیابیاں سمجھتا ہے۔ مسلمانوں میں استاد کی احسان شناسی اور احترام کا اندازہ کچھ اس رواج سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ شاگرد استاد کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنا لیتے تھے، اور اس طرح لائق شاگردوں کے ذریعے استاد کا نام زندہ رہتا تھا۔

ہمسایوں کے حقوق

انسان کو روزمرہ زندگی میں اپنے ہمسایوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کسی تکلیف یا بیماری کے وقت پڑوسی ہی وہ شخص ہوتا ہے جس کی مدد سب سے پہلے اور بآسانی دستیاب ہوتی ہے۔ جب کہ عزیز و اقارب تو اطلاع ملنے پر بہت دیر سے پہنچتے ہیں۔ مسجد میں نماز کی ادائیگی کے وقت بھی پڑوسی سے روزانہ ملاقات ہوتی ہے۔ پڑوسی اور اس کے اہل و عیال کے اخلاق و کردار سے خود ہمارے گھر والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اگر پڑوسی بُرا ہو تو اس سے انسان کا ناک میں دم آجاتا ہے۔ اسلام

نے پڑوسی کے حقوق پر بڑا زور دیا ہے اور پڑوسیوں کی تین قسمیں الگ الگ بیان کر کے ان سب سے حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے:۔

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ

(النساء : 36)

یعنی

وہ پڑوسی جو رشتے دار بھی ہو۔

وہ پڑوسی جو ہم مذہب یا رشتے دار نہ ہو۔

عارضی پڑوسی مثلاً ہم پیشہ، ہم جماعت، شریکِ سفر یا ایک ہی جگہ ملازمت یا کاروبار کرنے والے۔

ہمسایوں سے حُسنِ سلوک کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت تاکید فرمائی ہے۔ چند ارشادات درج ذیل ہیں:۔

(الف) وہ شخص مومن نہیں جو اپنے ہمسائے کی بھوک سے بے نیاز ہو کر شکم سیر ہو۔

(ب) تم میں سے افضل وہ ہے جو اپنے ہمسائے کے حق میں بہتر ہے۔

(ج) اگر پڑوسی کو مدد کی ضرورت پڑے تو اس کی مدد کرو۔ قرض مانگے تو اسے قرض دو۔ محتاج ہو جائے تو اس کی مالی امداد کرو۔ بیمار پڑ جائے تو علاج کرواؤ۔ اور مر جائے تو جنازے کے ساتھ قبرستان جاؤ۔ اور اس کے بچوں کی دیکھ بھال کرو۔ اگر اسے کوئی اعزاز حاصل ہو تو اسے مبارکباد دو۔ اگر مصیبت میں مبتلا ہو جائے، تو اس سے ہمدردی کرو۔ بغیر اجازت اپنی دیوار اتنی اُونچی نہ کرو کہ اس کے لیے روشنی اور ہوا رک جائے۔ کوئی میوہ یا سوغات وغیرہ لاؤ تو اسے بھی بھیجو۔

(د) حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں اتنی شدت سے تاکید فرماتے تھے کہ ہم یہ سوچنے لگے کہ شاید میراث میں بھی پڑوسیوں کا حصہ رکھ دیا جائے گا۔ (بخاری ۔ ادب)

(ہ) ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں ایک عورت کا ذکر آیا کہ وہ بڑی عبادت گزار اور پرہیزگار ہے۔ دن میں روزے رکھتی ہے اور رات کو تہجد ادا کرتی ہے لیکن پڑوسیوں کو تنگ کرتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا "وہ دوزخی ہے"۔ ایک دوسری عورت کے بارے میں عرض کیا گیا کہ وہ صرف فرائض (عبادات) ادا کرتی ہے لیکن ہمسایوں کے حقوق کا خیال رکھتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا "وہ جنتی ہے"۔

(و) حضورؐ نے تین مرتبہ قسم کھا کر فرمایا کہ وہ شخص کامل مومن نہیں جس کی شرارتوں اور اذیتوں سے اس کے پڑوسی امن میں نہ ہوں۔

غیر مسلموں کے حقوق

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس بات کی صراحت فرما دی ہے کہ کافر اور مشرک ہرگز ہرگز مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے باوجود غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی ہدایت کی ہے۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کے سے شہری حقوق عطا کرتا ہے اور مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ ان سے شفقت آمیز برتاؤ کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى

(سورہ المائدہ: 8)

ترجمہ:۔ اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔ عدل کرو۔ یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے۔

اسلام چاہتا ہے کہ اس کے پیروکار غیر مسلموں سے ویسا ہی برتاؤ کریں جیسا ایک ڈاکٹر مریض سے کرتا ہے۔ اسی حسن سلوک سے مسلمانوں نے ہمیشہ غیر مسلم اقوام کے دل جیتے۔

معاشرتی ذمہ داریاں

اسلام انسانی معاشرے کو خوش حال دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے اخلاقِ حسنہ کو بڑی اہمیت دی ہے اور مسلمانوں کے لیے اخلاقی قدروں کی پاسداری کو مذہبی فریضہ قرار دیا۔ اس سلسلے میں چند محاسنِ اخلاق کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

دیانت داری

معاشی اور معاشرتی تعلقات کی استواری کے لیے دیانت ایک بنیادی شرط ہے، جس معاشرے سے دیانت داری ختم ہو جائے وہاں کاروباری معاملات سے لے کر گھریلو تعلقات تک، ہر جگہ ناقابلِ اصلاح بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے، اور ایک دوسرے سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ اسلام اپنے نام لیواؤں کو ان تمام نقصانات سے بچانے کے لیے دیانت داری کی تلقین کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (سورہ النساء: 58)

ترجمہ:۔ بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کو۔

نیز جہاں دنیا و آخرت کی فلاح حاصل کرنے والوں کی دیگر صفات بتائی گئی ہیں، وہاں یہ بھی فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (سورہ المومنون: 8)

ترجمہ:۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کی نگہبانی کرتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے قبل بھی عرب کے بد دیانت معاشرے میں "الامین" یعنی دیانت دار کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احساسِ دیانت کا یہ عالم تھا کہ مدینے ہجرت کرتے وقت بھی ان لوگوں

کی امانتوں کی ادائگی کا اہتمام فرمایا۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کے درپے تھے۔ اسلام نے دیانت کے مفہوم کو محض تجارتی کاروبار تک محدود نہیں رکھا، بلکہ وسعت دے کر جملہ حقوقِ العباد کی ادائیگی کو دیانت کے دائرے میں شامل کر دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "محفل میں کی جانے والی باتیں بھی امانت ہیں"۔ یعنی ایک جگہ کوئی بات سن کر دوسری جگہ جا سنانا بھی بد دیانتی میں داخل ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ وہ اپنی تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی امانتیں سمجھیں، اور ان سب کو اس احساس کے ساتھ استعمال کریں کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کو ان کا حساب دینا ہے۔ دیانت کی اس تعریف کے پیشِ نظر ناممکن ہے کہ کوئی شخص مسلمان بھی ہو اور بد دیانت بھی۔ اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

"جس میں دیانت نہیں اس میں ایمان نہیں"۔

ایفائے عہد

انسانوں کے باہمی تعلقات میں ایفائے عہد یعنی وعدہ پورا کرنے کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ہمارے اکثر معاملات کی بُنیاد وعدوں پر ہوتی ہے وہ پورے ہوتے رہیں تو معاملات ٹھیک رہتے ہیں۔ اگر ان کی خلاف ورزی شروع ہو جائے تو سارے معاملات بگڑ جاتے ہیں۔ اسی بگاڑ سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اسلام ایفائے عہد کی تلقین کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (سورہ الاسراء : 34)

ترجمہ:۔ اور پورا کرو عہد کو بے شک عہد کی پوچھ ہو گی۔

انسان کے تمام وعدوں میں اہم ترین عہد وہ ہے، جو اس نے یومِ اَزل بندگی کے معاملے میں اپنے خالق سے کیا تھا۔ قرآن عظیم نے اس کی یاددہانی اس انداز سے کرائی ہے:۔

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝

(سورہ الانعام : 153)

ترجمہ:۔ اور اللہ کا عہد پورا کرو تم کو یہ حکم کر دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

ایک اور مقام پر باہمی معاہدوں اور اجتماعی رشتوں کی پاسداری کا لحاظ رکھنے کی ہدایت اس طرح فرمائی گئی۔

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (سورہ الرعد 21،20)

ترجمہ:۔ وہ لوگ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور نہیں توڑتے اس عہد کو اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں جن کو اللہ نے فرمایا ملانا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت سے سخت حالات میں بھی عہد کی پابندی فرمائی۔ مثلاً جب صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے اپنے جسم کے داغ دکھائے کہ اہلِ مکہ نے انھیں مسلمان ہو جانے پر کتنی اذیت دی ہے اور درخواست کی کہ انھیں مدینہ ساتھ لے جایا جائے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شفقت کے باوصف، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسلمانوں سے تھی۔ انھیں اپنے ہمراہ مدینے لے جانے سے محض اس لیے انکار کر دیا کہ قریش سے معاہدہ ہو چکا تھا، کہ مکہ سے بھاگ کر آنے والے مسلمانوں کو مدینے سے لوٹا دیا جائے گا۔ حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کی دردناک حالت تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بے قراری کا باعث تھی، لیکن صلح نامہ حدیبیہ کی پاسداری کے پیشِ نظر سب نے صبر و تحمل سے کام لیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خطبوں میں اکثر یہ بات فرماتے تھے:

لَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: جسے وعدے کا پاس نہیں اس میں دین نہیں۔

ہمارے لین دین کے جملہ معاملات اور باہمی حقوق ایفائے عہد ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس لیے دین داری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان سب کی پاسداری کریں۔

سچائی

سچائی ایک ایسی عالمگیر حقیقت ہے جسے تسلیم کیے بغیر انسان سُکھ چَین کا سانس نہیں لے سکتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کو نہایت جامعیت کے ساتھ یوں ارشاد فرمایا:۔

اَلصِّدْقُ یُنْجِیْ وَالْکِذْبُ یُهْلِکُ

ترجمہ:۔ سچائی انسان کو ہر آفت سے محفوظ رکھتی ہے اور جھوٹ اسے ہلاک کر ڈالتا ہے۔

قرآن کریم میں باری تعالیٰ نے اپنے صادق القول ہونے کا ذکر فرمایا۔ مثلاً:۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا (سورہ النساء : 87)

ترجمہ: اور اللہ سے سچی کس کی بات ہے

اِسی طرح قرآنِ حکیم میں انبیاء کی اس صفت کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے کہ وہ راست گفتار تھے۔ سچائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ تمام انبیاء نے وہیں سے سچائی حاصل کی اور دنیا میں پھیلائی۔ اس سچائی سے انکار کرنے والا زندگی کے ہر معاملے میں جھوٹ اور باطل کی پیروی کرتا ہے، اور ہلاک ہو کر رہتا ہے۔ اُردو میں ہم سچ کا لفظ محض گفتگو کے تعلق سے استعمال کرتے ہیں، لیکن قرآن مجید کے مفہوم میں قول کے ساتھ عمل اور خیال تک کی سچائی شامل ہے۔ یعنی صادق وہ ہے جو نہ صرف زبان ہی سے سچ بولے بلکہ اس کے فکر و عمل میں بھی سچائی رچی بسی ہو۔

عدل وانصاف

نظامِ عدل کی موجودگی میں معاشرے کے امور بخیر و خوبی سرانجام پاتے ہیں اور بے انصافی کی وجہ سے معاشرے کا ہر شعبہ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل دُنیا عدل و انصاف کے تصوّر سے خالی ہو چکی تھی۔ طاقتور ظلم وستم کو اپنا حق سمجھنے لگے تھے اور کمزور اپنی مظلومیّت کو مُقدّر سمجھ کر برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ دینِ اسلام کے طُفیل ظلم وستم کا یہ کاروبار بند ہوا اور دُنیا عدل و انصاف کے اس اعلیٰ معیار سے آشنا ہوئی جس نے رنگ و نسل اور قوم و وطن کے امتیازات کو مٹا کر رکھ دیا۔ ناانصافی کی بناء پر انسانوں کے مختلف طبقوں اور گروہوں کے درمیان نفرت کی جو دیوار کھڑی ہو گئی تھی، اسلام نے اسے گرا کر انسان کو انسان کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا۔ اس طرح لوگوں کے درمیان انس و محبت کا وہ رشتہ استوار ہوا جو انسانیّت کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے عدل و انصاف کے معاملے میں بلاامتیاز تمام نسلِ انسانی کے درمیان مساوات قائم کرنے کا حکم دیا۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (سورہ المائدہ : 8)

ترجمہ: اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی۔ اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔ عدل کرو۔ یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے۔

رنگ و نسل کی طرح اِسلام کے تصوّرِ عدل میں کسی کے اعلیٰ منصب اور مرتبے کو کوئی اہمیّت نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ ارشادات آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ بنی مخزوم کی فاطمہ نامی خاتون کی چوری سے متعلق سزا کی معافی کی سفارش سن کر ارشاد فرمائے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، "تم سے پہلے قومیں اسی سبب سے برباد ہوئیں، کہ ان کے چھوٹوں کو سزا دی

تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔"

اسلامی حکومت کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے اپنے باشندوں کو ہمیشہ بے لوث انصاف فراہم کیا ہے اور حقیقت میں اِسلامی حکومت کا اصل مقصد ہی نظامِ عدل کا قیام ہے۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سلطانِ عادل کو خدا کا سایہ قرار دیا۔

اِحترامِ قانون

جس طرح قدرت کا نظام چند فطری قوانین کا پابند ہے، اسی طرح معاشرے کا قیام و دوام، معاشرتی، اخلاقی اور دینی احکام و قوانین پر موقوف ہے۔ یوں تو دُنیا کا کم عقل انسان بھی قانون کی ضرورت، اس کی پابندی اور اہمیت کا اعتراف کرے گا، لیکن کم لوگ ایسے ہیں جو عملاً قانون کے تقاضے پورے کرتے ہوں۔ عصرِ حاضر میں دو افراد کے باہمی معاملات سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک لوگ ضابطے اور قانون کی پابندی سے گریزاں ہیں، اور لاقانونیت کے اس رُجحان نے دُنیا کا امن و سکون غارت کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان قانون کی افادیت کا قائل ہونے کے باوجود اس کی خلاف ورزی کیوں کرتا ہے؟ اس کی دو اہم وجوہ ہیں:۔

ایک خود غرضی اور مفاد پرستی۔

دوسرے اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھنا۔

اسلام ان دونوں وجوہ کا خُوبی سے تدارک کر کے مسلمانوں کو قانون کا پابند بناتا ہے۔ ایک طرف وہ انھیں خدا پرستی اور ایثار و سخاوت کا درس دیتا ہے دوسری طرف ان میں آخرت کی جواب دہی کا اِحساس و شعور پیدا کرتا ہے۔ اِسلام انھیں اِحساس دلاتا ہے کہ وہ اپنے اثر و رسوخ یا دھوکے فریب سے دنیا میں قانون کی خلاف ورزی کی سزا سے بچ بھی گئے تو آخرت میں انھیں خدا کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ آخرت میں جواب دہی کا یہی اِحساس اسلامی معاشرے کے گناہ میں ملوث ہو جانے والے افراد

کو از خود عدالت میں جانے پر مجبور کرتا ہے اور وہ اصرار کرتے ہیں کہ انھیں دُنیا ہی میں سزا دے کر پاک کر دیا جائے تاکہ وہ آخرت کی سزا سے بچ جائیں۔

لوگوں کے دلوں میں قانون کے احترام کا سچا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خود حکمران طبقہ بھی قانون کی پاسبانی کرے اور اپنے اثر و رسوخ کو قانون کی زد سے بچنے کا ذریعہ نہ بنائے۔ آج دُنیا کا شاید ہی کوئی دستور یا آئین ایسا ہو، جس میں حکمران طبقے کو مخصوص مراعات مہیا نہ کی گئی ہوں، اور قانون میں آقا و غلام اور شاہ و گدا کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ اِسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی زرہ گم ہو گئی اور ایک یہودی کے پاس ملی۔ خود خلیفۂ وقت ہونے کے باوصف آپ اسے قاضی کی عدالت میں لے گئے اور جب اس نے آپ کے بیٹے اور غلام دونوں کی گواہی ان سے قریبی تعلق کی بناء پر قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپ دعوےٰ سے دستبردار ہو گئے۔ اِحترامِ قانون کی اس مثال نے یہودی کو اتنا متاثر کیا کہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

کسبِ حلال

کسبِ حلال کے بارے میں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا

(سورہ المومنون : 51)

ترجمہ:۔"اے رسولو! کھاؤ ستھری چیزیں اور کام کرو بھلا۔"

اسی طرح تمام انسانوں کو تلقین فرمائی گئی۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا (سورہ البقرہ : 168)

ترجمہ:۔"اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ۔"

مزید براں مسلمانوں کو خصوصی تاکید کی گئی:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ
(سورہ البقرہ : 172)

ترجمہ :- اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو۔

اسلام میں عبادات اور معاملات کے ضمن میں کسبِ حلال کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے عبادات کی مقبولیت کے لیے کسبِ حلال کو لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (سورہ البقرہ : 188)

ترجمہ :- اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق۔

جس معاشرے میں ناجائز ذرائع آمدنی یعنی ناانصافی، بددیانتی، رشوت ستانی، سود خوری، چوری، ڈاکہ زنی، ذخیرہ اندوزی، فریب دہی اور سٹے بازی کا رواج عام ہو جائے تو اس معاشرے کی کشتی تباہی کے گرداب میں پھنس کر رہ جاتی ہے اور بربادی اس معاشرے کا مقدر بن جاتی ہے۔ اِسلام ہر معاملے میں کسبِ معاش کے ان تمام غلط طریقوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور ناجائز ذرائع کے اختیار کرنے والوں کو جہنم کی خبر دیتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے "حرام رزق پر پلنے والے جسم کو جہنم ہی کا ایندھن بننا چاہیے"۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر یقین ہوگا۔ وہ کبھی جائز وسائل کو چھوڑ کر ناجائز ذرائع کا رُخ نہیں کرے گا، خواہ ان میں کتنی ہی دلکشی کیوں نہ ہو۔ البتہ جو شخص اس شیطانی وسوسے میں مبتلا ہو کہ میں ناجائز ذرائع سے اپنے مقدر سے زیادہ کما سکتا ہوں، وہی حرام طریقوں کا سہارا لے گا۔ شیطان کے اس حربے کو ناکام بنانے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ اعلیٰ معیارِ زندگی کا ڈھونگ رچانے کی بجائے سادگی، کفایت شعاری، میانہ روی اور قناعت پسندی کے اصولوں پر کاربند رہا جائے۔

ایثار

دنیا پرستی اگر انسان کو خود غرضی اور مفاد پرستی سکھاتی ہے تو دین داری اس میں

جذبہ ایثار پیدا کرتی ہے۔ وہ خود تکلیف اٹھا کر مخلوقِ الٰہی کو راحت و آرام پہنچاتا ہے۔ اس کا عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت پائے گا اور اُخروی نعمتوں کے حصول کا سبب بنے گا۔

دیگر محاسنِ اَخلاق کی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایثار و سخاوت کا بہترین نمونہ تھے اور سربراہِ مملکت ہوتے ہوئے بھی اِنتہائی سادگی اور جفاکشی کی زندگی گزارتے تھے۔ خانۂ مبارک میں ہفتوں چولہا نہیں جلتا تھا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر سے کوئی سائل محروم نہیں لوٹا۔ اپنے پاس کچھ موجود نہ ہوتا تو قرض لے کر حاجت مند کی حاجت پوری کرتے۔ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جانور ذبح فرمایا، اور گوشت تقسیم کی غرض سے گھر بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد گھر میں آکر دریافت فرمایا: کتنا تقسیم ہو گیا ہے اور کتنا بچا۔ عرض کیا گیا کہ عمدہ قسم کا گوشت تقسیم ہو گیا اور خراب قسم کا گوشت باقی رہ گیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اور جو تقسیم ہو گیا ہے، وہ رہ گیا اور جو باقی بچا ہے، حقیقت میں وہ چلا گیا ہے"۔

صحابہ رضی اللہ عنہم بھی جذبۂ اِیثار سے سرشار تھے اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی حاجت کو ترجیح دیتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ رومیوں کے مقابلے میں جانے والی فوج کے ساز و سامان کے لیے مسلمانوں سے مالی اعانت طلب کی گئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گھر کا سارا سامان لے آئے۔ ایک دفعہ حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ نے قحط کے زمانے میں باہر سے آنے والا غلہ دوگنے، چوگنے منافع کی پیش کش کرتے ہوئے خریدا، اور بلامعاوضہ تقسیم کر دیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اِیثار کے سلسلے میں ایک واقعہ بڑا اثر انگیز ہے۔ ایک بار کوئی بھوکا پیاسا شخص حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دولت کدے پر پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ حسبِ دستور ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ گھر پہنچ کر بیوی سے معلوم ہوا کہ کھانا صرف بچوں کے لیے کافی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کو بہلا کر فاقے

کی حالت میں سلا دو اور کھانا شروع کرتے وقت کسی بہانے چراغ بجھا دینا تاکہ مہمان کو یہ اندازہ نہ ہوسکے کہ ہم کھانے میں شریک نہیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ مہمان نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور انصاری کا یہ پورا گھرانا بھوکا سویا۔ صبح جب یہ صحابی رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اللہ جل شانہ تمہارے رات کو حسنِ سلوک سے بہت خوش ہوا۔ ایسے ہی ایثار پیشہ لوگوں کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ

(سورہ الحشر: 9)

ترجمہ: اور وہ دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود فاقے ہی سے کیوں نہ ہوں۔

ہجرت کے موقع پر انصارِ مدینہ نے مہاجرینِ مکہ کے ساتھ حسنِ سلوک کے سلسلے میں جس ایثار و قربانی کا ثبوت دیا اس کی مثال تاریخِ عالم میں ڈھونڈے نہیں ملتی۔

اَخلاقی رذائل

جس طرح اَخلاقِ حسنہ کی ایک طویل فہرست ہے، جن کو اپنا کر آدمی دُنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کچھ ایسے اَخلاق رذیلہ ہیں جن کو اختیار کر کے انسان حیوانی درجے میں جا گرتا ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اَخلاقِ فاضلہ سے آراستہ ہوں اور اَخلاقِ رذیلہ سے بچیں، جو انسان کی شخصیت کو داغ دار کر دیتے ہیں اور اُسے ہر قسم کی نیکی اور بھلائی سے محروم کر دیتے ہیں۔ چند اَخلاقِ رذیلہ کا بیان ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جھوٹ

جھوٹ نہ صرف یہ کہ بجائے خود ایک بُرائی ہے، بلکہ بہت سی دوسری

اَخلاقی برائیوں کا سبب بھی بنتا ہے۔ اسلام میں جھوٹ بولنے کی سختی سے مذمت کی گئی ہے۔ جھوٹ بولنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے۔ اِسی طرح اِرشاد باری تعالیٰ ہے کہ جھوٹے آدمی کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝ (سورہ الزمر: 3)

ترجمہ: البتہ اللہ راہ نہیں دیتا اس کو جو جھوٹا حق نہ ماننے والا ہو۔

اسی لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مومن کی فطرت میں ہر خصلت ہو سکتی ہے، مگر خیانت اور جھوٹ کی خصلت مومن میں ہرگز ممکن نہیں۔

(رواہ البیہقی عن سعد بن ابی وقاص)

مسند احمد میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی شخص نے دریافت کیا: "یا رسُول اللہ! جنت میں لے جانے والا کون سا عمل ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "سچ بولنا۔ جب بندہ سچ بولتا ہے۔ اس سے اس کے ایمان میں اِضافہ ہوتا ہے اور ایمان میں یہ اضافہ جنت میں داخلے کا سبب بنتا ہے۔" اس شخص نے دریافت کیا۔ "یا رسُول اللہ! دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے۔" فرمایا: "جھوٹ بولنا۔ جب بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام کرے گا۔ جب گناہ کے کام کرے گا تو گویا کفر کرے گا اور یہ کفر اسے جہنم میں لے جائے گا۔" جھوٹ کا تعلق محض زبان سے نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ناپسندیدہ اعمال بھی جھوٹ کی تعریف میں آتے ہیں۔ مثلاً غلط طریقے سے کسی کا مال ہتھیانا، کم تولنا، غرور کرنا، منافقت سے کام لینا وغیرہ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمود و نمائش کو بھی جھوٹ کی ایک قسم قرار دیا۔ جھوٹ کے نتیجے میں باہمی اعتماد نہیں رہتا۔ انسان کی ساکھ ختم ہو جاتی ہے اور معاشرتی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے مسلمانوں کو چاہیے کہ جھوٹ کی ہر قسم سے پرہیز کریں۔

غیبت

اَخلاقی بیماریوں میں غیبت جس قدر بُری بیماری ہے بدقسمتی سے ہمارے معاشرے

میں اسی قدر عام ہے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو اس بیماری سے محفوظ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس گناہ سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا ہے :۔

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ (سورہ الحجرات : 12)

ترجمہ :۔ اور بُرا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو، بھلا خوش لگتا ہے۔ تم میں کسی کو کہ کھائے گوشت اپنے بھائی کا جو مردہ ہو، تو گھن آتی ہے تم کو اس سے۔

غیبت کے لیے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کی تمثیل اِنتہائی بلیغ ہے۔ کیونکہ جس شخص کی غیبت کی جاتی ہے، وہ اپنی مدافعت نہیں کرسکتا۔ اس طرح غیبت سے باہمی نفرت کو ہوا ملتی ہے اور دشمنی کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ غیبت کے مرض میں مبتلا شخص خود کو عموماً عیبوں سے پاک تصور کرنے لگتا ہے، اور جس کی غیبت کی جائے وہ اپنے عیب کی تشہیر ہوجانے کے باعث اور ڈھیٹ ہوجاتا ہے۔ غرض غیبت ہر لحاظ سے معاشرتی سکون کو برباد کرتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے معراج کے واقعات بیان کرتے ہوئے اِرشاد فرمایا کہ میں نے ایک گروہ کو دیکھا کہ ان کے ناخن تانبے کے تھے، اور وہ لوگ اس سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے جبریل علیہ السلام سے دریافت کیا۔ یہ کون لوگ ہیں ؟ فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی عزت وآبرو بگاڑتے ہیں (یعنی غیبت کرتے ہیں)

شریعتِ اِسلامی میں غیبت صرف دو صورتوں میں جائز قرار دی گئی ہے۔ ایک مظلوم کی ظالم کے خلاف فریاد کی شکل میں اور دوسرے لوگوں کو کسی فریب کار کی فریب کاری سے آگاہ کرنے کے لیے۔ بعض علماء نے نقل اُتارنے اور تحقیر آمیز اشارات کرنے کو بھی غیبت میں شمار کیا ہے۔

غیبت و اِتّہام کا فرق

غیبت اور اِتہام میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ غیبت سے مراد کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی ایسی برائی بیان کرنا ہے، جو اس میں موجود ہے، جب کہ تہمت لگانے سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کا ایسا عیب بیان کیا جائے جو اس میں موجود نہ اور اس کے دامنِ عفت کو بلاوجہ داغ دار بنایا جائے۔

منافقت

عُلمائے اِسلام نے منافق کی دو اَقسام بیان کی ہیں۔ ایک وہ منافق جو دل سے اسلام کی صداقت وحقانیت کا قائل نہیں، لیکن کسی مصلحت یا شرارت کی بناء پر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں اور اسلام دونوں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اسے اعتقادی منافق کہتے ہیں۔ دوسرا وہ منافق ہے جو اگرچہ خلوصِ نیت سے اسلام قبول کرتا ہے لیکن بعض بشری کمزوریوں کی وجہ سے اسلام کے عملی احکام پر چلنے میں تساہل یا کوتاہی کرتا ہے۔ اسے عملی منافق کہتے ہیں۔ پہلی قسم کا منافق کافروں سے بدتر ہے، جب کہ دوسری قسم کا منافق صاحبِ اِیمان ضرور ہے لیکن اس کی تعلیم وتربیت ابھی ناقص ہے جو کسی مُعلّم ومربّی کے فیضانِ محُبت سے اسے حاصل ہوسکتی ہے۔

مسلمانوں کے خلاف منافقوں کی سب سے خطرناک چال یہ ہوتی ہے کہ وہ دین داری کے پردے میں مسلمانوں کو باہم لڑا دیں۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے مدینے میں مسجد نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مقابل مسجد ضرار تعمیر کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اس مسجد کو مسمار کرا کے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ط (سورہ التحریم : 9)

ترجمہ:۔اے نبی! لڑائی کر منکروں سے اور دغا بازوں سے اور سختی کر ان پر اور ان کا گھر دوزخ ہے:

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منافق کی پہچان بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں۔

1۔ جب بولے تو جھوٹ بولے۔
2۔ جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔
3۔ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

ان نشانیوں کے ہوتے ہوئے چاہے وہ نماز اور روزے کا پابند ہو، وہ منافق ہی ہے۔ قرآن مجید میں ان منافقوں کے انجام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ دوزخ کے سب سے نچلے اور تکلیف دہ حصّے میں رکھے جائیں گے۔

تکبّر

تکبر کے معنی خود کو بڑا اور برتر سمجھنے اور ظاہر کرنے کے ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوقات میں سب سے پہلے شیطان نے تکبّر کیا اور کہا کہ میں آدم علیہ السلام سے افضل ہوں۔ اس لیے ان کو سجدہ نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا:۔

فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ

(سورہ الاعراف: 13)

ترجمہ:۔ تو اُتر یہاں سے۔ تو اس لائق نہیں کہ تکبّر کرے یہاں۔ پس باہر نکل تو ذلیل ہے۔

وہ دن اور آج کا دن، غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا چلا آیا ہے۔ اور فرمانِ الٰہی کے مطابق، آخرت میں بھی متکبر انسانوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْمُتَكَبِّرِينَ ٥ (سورہ الزمر: 60)

ترجمہ:۔ کیا نہیں دوزخ میں ٹھکانہ غرور کرنے والوں کا۔

تکبّر کی مذمّت فرماتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "جس کے دل میں رائی برابر بھی غرور اور تکبّر ہوگا وہ انسان جنّت میں داخل نہیں ہوگا۔"

مغرور و متکبّر انسان دوسروں کو حقیر سمجھ کر ظلم و زیادتی کرتا ہے اور گناہوں پر بے باک ہوجاتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ مجھے میرے گناہوں کی سزا کون دے سکتا ہے۔ اسی لیے وہ مُروت، اخوت، ایثار اور اس قسم کی سبھی بھلائیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

حسد

انسان دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے کسی بھائی کو اچھی حالت میں دیکھیں تو خوش ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے لیکن حسد وہ بُری خصلت ہے۔ جو کسی کو خوش حال اور پُرسکون دیکھ کر انسان کو بے چین کر دیتی ہے، اور وہ اپنے بھائی کی خوشحالی دیکھ کر خوش ہونے کی بجائے دل ہی دل میں جلتا اور کُڑھتا ہے۔ ایسا کرنے سے وہ دوسروں کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا، خود اپنے لیے پریشانی مول لے لیتا ہے۔ یوں تو حسد ایک اَخلاقی بیماری ہے لیکن اس کے نتیجے میں انسان کئی دوسری اخلاقی بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ مثلاً جب وہ دوسروں کو بہتر حالت میں دیکھنے کا روادار نہیں ہوتا تو اپنے بہُت سے عزیزوں سے ترکِ تعلق کر لیتا ہے جو ایک ناپسندیدہ بات ہے۔ اسی طرح جس شخص کی طبیعت میں حسد پیدا ہو جائے، وہ کبھی قانع نہیں ہوسکتا۔ وہ ہمیشہ اپنے سے برتر کو دیکھ کر اپنی حالت زار پر کفِ اَفسوس ملتا رہتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اپنی حالت بہتر بنانے پر صرف ہوسکتی ہیں، ہمیشہ دوسروں کی حالت کو بگاڑنے ہی کی فکر میں ضائع ہوتی رہتی ہیں۔ حاسد اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں خود ہی جلتا رہتا ہے۔ گو اِسلام اپنے پیروکاروں کو باہمی محبّت اور اِحسان کی تلقین کرتا ہے، تاکہ معاشرتی اِعتبار سے اِجتماعی فلاح حاصل ہوسکے

لیکن حاسد کے دل میں سوائے نفرت اور جلن کے کوئی شریفانہ جذبہ جگہ نہیں پاسکتا۔ اجتماعی فلاح کے معانی یہ ہیں کہ معاشرے کے جملہ افراد معزز اور خوشحال ہوں۔ لیکن حاسد لوگوں کی نیک نامی اور خوشحالی کو ذلت و خواری میں بدلتے دیکھنا چاہتا ہے۔ جس ایک نہ ایک دن وہ معاشرے کی نظروں میں ذلیل ہو کر رہتا ہے۔ مسلمانوں کو ان تمام نقصانات سے بچانے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسد سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ ارشاد فرمایا:۔

اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔

ترجمہ:۔ دیکھو! حسد سے بچو۔ کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے۔
جیسے آگ خشک لکڑی کو۔

اگر انسان حسد اور اس جیسے دوسرے اخلاقِ رذیلہ سے بچنا چاہتا ہے تو اسے رسُول پاکؐ، صحابہؓ اور بزرگانِ دین کی سادگی و قناعت کی تاریخی مثالوں سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے، اور اس کے ساتھ اسے یہ بھی چاہیے کہ دولت و اقتدار سے پیدا ہونے والی برائیوں اور مفاسد پر نظر رکھے۔

سوالات

1 ۔ ارکانِ اسلام سے کیا مراد ہے ؟ فرد کی تعمیرِ سیرت اور معاشرے کی تشکیل میں نماز کیا کردار ادا کرتی ہے ؟

2 ۔ روزے کے مقاصد بیان کریں اور عملی زندگی پر اس کے اثرات تفصیل سے لکھیں۔

3 "اِسلام کے معاشی نظام میں زکوٰۃ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔" اس موضوع پر مُفصل اِظہارِ خیال کریں۔

4 ۔ حج کا فلسفہ کیا ہے ؟ نیز اس کے انفرادی اور اجتماعی فوائد بیان کریں۔

5 ۔ جہاد سے کیا مراد ہے ؟ اس کی قسمیں اور فضائل بیان کریں۔

6 ۔ اُولاد کے حقوق و فرائض قرآن و سُنت کی روشنی میں واضح کریں۔

7 ۔ اِسلام نے عورت کو معاشرہ میں کیا مقام دیا ہے ؟ اس کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں بیان کریں۔

8 ۔ مندرجہ ذیل کے حقُوق و فرائض پر مختصر نوٹ لکھیں۔
رشتہ دار ، ہمسائے ، اساتذہ ، غیر مُسلم۔

9 ۔ اِسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے کن اُمور کی پابندی ضروری ہے ؟

10 ۔ رذائل اَخلاق سے کیا مراد ہے ؟ ایسے پانچ رذائل کا ذکر کریں اور بتائیں کہ ان سے معاشرے میں کیسے بگاڑ پیدا ہوتا ہے ؟

باب سوم

اُسوۂ رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم

حضرت محمّد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اللہ کے بندے اور اس کے رسُول ہیں۔ انھوں نے ایک مثالی انسان کی زندگی گزاری۔ دکھ سہے، خوشیاں دیکھیں، ناکامیاں برداشت کیں، اور کامیابیاں حاصل کیں۔ جنگیں بھی لڑیں اور امن کی حالت میں بھی رہے۔ سفر کی زندگی بھی دیکھی اور گھر کی بھی۔ اور تمام حالتوں میں اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے راستے سے سرِمُو نہیں ہٹے، اور اللہ کے اَحکام بہترین طریقے سے بجا لاتے رہے۔ اس طرح انھوں نے ہمیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام بجا لانا اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ایک مسلمان کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔

رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زندگی قرآن مجید کی تشریح و تفسیر ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے۔

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنُ

ترجمہ:۔ "قرآن مجید ہی آپ کا اَخلاق تھا"

اس لیے آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کو سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے میں دین و دُنیا کی بھلائی ہے:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورہ الاحزاب : 21)

"تم لوگوں کے لیے رسُول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے"

اُسوۂ حَسنہ کی تفصیلات سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں جو اس مختصر باب میں نہیں سما سکتیں۔ البتہ ہم حضورؐ کے اَخلاقِ مبارک میں سے چند ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

رحمتہٌ لِلعَالمین

اللہ تعالیٰ نے رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو تمام جہانوں کے لیے رحمت

بنا کر بھیجا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (سورہ الانبیاء : 107)

ترجمہ:۔ "ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے"

آپؐ نے دُنیا کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا کر اس کے عذاب سے بچایا۔ ایک اللہ کی عبادت اور اس سے محبت سکھائی۔ ایک ایسا نظامِ زندگی دیا جو انسانیت کو اَمن و سلامتی کی طرف لے جاتا ہے اور نوعِ اِنسان کے لیے سراسر رحمت ہے۔ اس طرح آپؐ تمام جہانوں کے لیے اللہ کی رحمت ثابت ہوئے۔ آپؐ خود بھی رحمت اور محبت کا پیکر ہیں۔ تمام عمر آپ مخلوقِ خدا سے لطف و کرم کے ساتھ پیش آتے رہے۔

اُمت پر شفقت و رحمت

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے بارے میں فرمایا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (سورہ التوبہ : ۸)

ترجمہ:۔ "تمھارے پاس اللہ کا ایک رسُول آیا ہے۔ جو تمھیں میں سے ہے۔ تمھاری تکلیف اس پر گراں گزرتی ہے۔ تمھاری بھلائی کے خواہش مند رہتے ہیں۔ اہل ایمان کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں"

آپؐ قرض داروں کا قرض ادا فرماتے، حاجت مندوں کی حاجت پوری کرتے۔ ناداروں اور مفلوک الحال لوگوں کی مدد کرتے۔ آپؐ نے عمر بھر اپنے دروازے سے کسی سائل کو محروم واپس نہیں لوٹایا۔ اپنے ساتھیوں کو تکلیف میں دیکھ کر بے قرار ہو جاتے اور ان کی اعانت فرماتے۔ غم زدوں کی دلجوئی کرتے۔ آپؐ کو اپنے صحابہؓ کی تکلیف اتنی گراں گزرتی کہ انھیں دینی امور میں بھی دشواری میں ڈالنا پسند نہ فرماتے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: "اگر اُمت پر دشواری نہ ہوتی تو میں انھیں ہر نماز کے لیے مسواک کرنے کا حکم دیتا" آپؐ اہل ایمان کے لیے بالخصوص سراپا رحمت ہیں۔

کافروں پر رحمت

آپؐ کی رحمت صرف مومنین تک محدود نہ تھی، کافروں کے لیے بھی ہمیشہ رحمت رہے۔ گذشتہ امتوں پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے مختلف عذاب آتے رہے لیکن رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات کی وجہ سے کفار مکہ تمام تر نافرمانیوں کے باوجود دُنیا میں عذاب سے محفوظ رہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ط (سورہ الانفال : 33)

ترجمہ :"اور اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا جب تک آپؐ ان میں موجود ہیں"۔

ایک دفعہ آپؐ کو کفار کی طرف سے سخت تکلیف پہنچی۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسُول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے لیے بددعا کریں۔ آپؐ نے فرمایا! میں لعنت کرنے والا نہیں۔ میں تو صرف رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ قبیلہ دوس نے سرکشی و نافرمانی کی تو آپؐ نے بددعا کی جگہ یہ دعا کی۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا وَّائْتِ بِهِمْ

ترجمہ :"اے اللہ! قبیلہ دوس کو ہدایت دے اور ان کو دائرہ اسلام میں لا"۔

طائف میں جب کفار نے آپؐ کو پتھر مار مار کر زخمی کیا تو آپؐ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

ترجمہ :۔اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے۔ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔

عورتوں کے لیے رحمت

عرب کے معاشرے میں عورت کی کوئی عزت تھی نہ مقام تھا۔ لڑکیوں کا وجود

باعثِ شرم سمجھا جاتا تھا۔ حضورؐ نے انھیں عزت واحترام عطا کیا۔ ان کے حقوق اور فرائض متعین کیے اور انھیں ماں، بیٹی، بہن اور بیوی ہر حیثیت سے معاشرے میں صحیح مقام سے نوازا۔ آپؐ کا ارشاد ہے۔

"اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ"

ترجمہ :"جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے"۔

آپؐ نے یہ بھی فرمایا :

"خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ"

ترجمہ :"تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے"۔

بچوں کے لیے رحمت

نبی محترمؐ بچوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے اور ان سے بے انتہا پیار کرتے۔ ایک دفعہ رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسن بن علیؓ سے پیار کر رہے تھے۔ اقرع بن حابس تمیمی بھی محفل میں موجود تھے۔ انھوں نے کہا، یا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے دس بچے ہیں۔ میں نے کبھی کسی کو اس طرح پیار نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔

"جو رحم نہیں کرتا۔ اس پر رحم نہیں کیا جاتا"۔

یتیموں اور غلاموں کے لیے رحمت

آپؐ یتیم بچوں پر بہت زیادہ مہربان تھے۔ آپؐ نے فرمایا :

"اَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيْمِ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا"

ترجمہ :"میں اور یتیم کی نگہداشت کرنے والا جنت میں یوں ہوں گے (اور اپنی دونوں انگلیاں ملالیں)"۔

اس طرح غلاموں کے متعلق آپؐ کا ارشاد ہے کہ "تمھارے غلام تمھارے بھائی ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے تمھارا ماتحت بنایا ہے۔ تم جو خود کھاؤ، وہی انھیں بھی

کھلاؤ۔ اور جیسا خود پہنو ویسا ہی انھیں بھی پہناؤ۔ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر کام کا بوجھ نہ ڈالو۔"

اخوت

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے عرب معاشرے میں فتنہ وفساد اور جنگ وجدال روزمرہ کا معمول تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر آپس میں لڑ پڑتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر قبیلوں میں لڑائیاں چھڑ جاتی تھیں۔ اور پھر سالہا سال تک جاری رہتی تھیں۔ آپؐ نے اپنے کردار اور انقلابی تعلیم سے ان کا مزاج بدل دیا دشمن دوست ہو گئے اور خون کے پیاسے بھائی بن گئے۔ اسی نعمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (سورہ آل عمران : 103)

ترجمہ:۔ اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو۔ جب کہ تم دشمن تھے، تو اللہ تعالیٰ نے تمھارے قلوب میں اُلفت ڈال دی۔ سو تم اس کے انعام سے آپس میں بھائی ہو گئے۔

محبّت کا یہ جذبہ جو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں پیدا ہُوا کسی اور طریقے سے نہیں پیدا کیا جا سکتا تھا۔ نہ وعظ ونصیحت سے اور نہ مال دولت سے۔

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (سورہ الانفال : 63)

ترجمہ:۔ "اور ان کے قلوب میں اُلفت پیدا کر دی اور اگر آپ دُنیا بھر کا مال خرچ کرتے تب بھی ان کے قلوب میں اُلفت پیدا نہ کر سکتے لیکن اللہ ہی نے ان میں باہم محبت پیدا کر دی۔ بے شک وہ زبردست اور حکمت والا ہے۔"

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپؐ نے مہاجرینِ مکہ وانصارِ مدینہ کے درمیان بھائی چارے کا رشتہ قائم کر دیا۔ ہر مہاجر کو کسی اُنصاری کا دینی بھائی بنایا اور اس طرح "مُواخات" کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا جس کی مثال دُنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ انصار نے اپنے مکانات، باغات اور کھیت آدھوں آدھ اپنے بھائیوں کو پیش کیے۔ تاہم اکثر مہاجرین نے تجارت ومحبت سے پیٹ پالنے کو ترجیح دی۔

مسلمانوں پر جب بھی کوئی تکلیف کا وقت آئے، تو دوسرے مسلمانوں کو اس تکلیف میں مالی وجانی دونوں طریقوں سے شرکت کرنی چاہیے۔ یہی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ حسنہ ہے۔

مسلمان جب بھی کسی تکلیف میں مبتلا ہوں تو دوسرے مسلمان بھائیوں کو رسُول رحمتؐ کے اسوہ حسنہ کو پیش نظر رکھتے ہُوئے ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ اور انھیں تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" (سورہ الحجرات : 10)

ترجمہ:۔ "یقیناً تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔"

رُسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

"اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يُسْلِمُهٗ"

ترجمہ:۔ "مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے۔ اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔"

مساوات

مساوات اِسلامی معاشرے کی بنیاد ہے۔ جس کے بغیر کوئی معاشرہ نہ صالح رہ سکتا ہے نہ ترقی کر سکتا ہے۔ اونچ نیچ اور ذات پات کے امتیازات سے معاشرے میں ہزاروں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اپنے

قول وعمل سے مساوات کی بہترین تعلیم دی ہے۔

آپؐ کے نزدیک امیر وغریب حاکم ومحکوم آقا وغلام سب برابر تھے۔ آپؐ نے ذات پات اور رنگ ونسل کے تمام امتیازات مٹا دیے۔ حضرت سلمان فارسیؓ صہیب رومی اور بلال حبشیؓ کی قدر ومنزلت رسولؐ اللہ کی نگاہ میں قریش کے معززین سے کم نہ تھی۔ مساوات کا عملی مظاہرہ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے اپنی پھوپھی زاد حضرت زینبؓ کی شادی اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے کروا دی۔ خود اپنے بیٹھنے کے لیے الگ جگہ مخصوص نہ کی۔ صحابہ کرام کے درمیان بے تکلفی سے بیٹھ جاتے۔ آپؐ کا لباس عام مسلمانوں کا لباس تھا۔ آپؐ کا حجرہ نہایت سادہ اور مختصر تھا۔ اور آپؐ کی غذا سادہ تھی۔

مسجدِ قبا اور مسجدِ نبوی کی تعمیر میں آپؐ نے صحابہ کے ساتھ مل کر کام کیا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر اپنے ہاتھوں سے پتھر توڑے اور خندق کھودی اور کسی موقع پر بھی اپنے آپ کو دوسروں سے برتر نہیں سمجھا۔

خطبہ حجۃ الوداع میں آپؐ سے ساری دُنیا کے انسانوں کو مساوات کا پیغام دیتے ہوئے فرمایا۔

" اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَّاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَّ لَا اَبْیَضَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَبْیَضَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی "

ترجمہ:۔ "اے لوگو! تم سب کا پروردگار ایک ہے اور تم سب کا باپ بھی ایک ہے۔ کوئی فضیلت نہیں عربی کو عجمی پر نہ عجمی کو عربی پر۔ نہ گورے کو کالے پر نہ کالے کو گورے پر، سوائے تقوی کے۔

صبر و استقلال

صبر کے لغوی معنی روکنے اور برداشت کرنے کے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو خوف

اور گھبراہٹ سے روکنا اور مصائب و شدائد کو برداشت کرنا۔ اِستقلال کے لغوی معنی اِستحکام اور مضبوطی کے ہیں۔ الغرض صبر و استقلال، دل کی مضبوطی، اخلاقی بلندی اور ثابت قدمی کا نام ہے۔ قرآن مجید میں صبر کی بڑی فضیلت اور اہمیت بیان کی گئی ہے۔ قرآن میں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت نقل کی گئی ہے:

" وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ط اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

(سورہ لقمان : 17)

ترجمہ:۔ اور جو مصیبت تجھے پیش آئے اسے برداشت کر۔ یہ بڑے عزم کی بات ہے۔

دوسری جگہ پر فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (سورہ بقرہ : 153)

ترجمہ:۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مصیبت اور پریشانی کے وقت اپنے بندوں کو صبر و رضا کی تاکید کی ہے اور چونکہ انسان کی جان اور اس کا مال سب اللہ کا عطا کردہ ہے۔ اس لیے انسان پر لازم ہے کہ آزمائش کے وقت رضائے اِلٰہی کی خاطر صبر و سکون سے کام لے۔ جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت کا اعلان فرمایا تو کفار نے آپؐ کو طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ آپؐ کو جھٹلایا۔ آپؐ کا مذاق اڑایا۔ کسی نے (معاذ اللہ) جادوگر کہا اور کسی نے کاہن، مگر آپؐ نے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور تبلیغِ دین سے منہ نہ موڑا۔

ایک دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خانہ کعبہ کے نزدیک نماز پڑھ رہے تھے۔ حرم شریف میں اس وقت کفار کی ایک جماعت موجود تھی۔ عقبہ بن ابی معیط نے ابوجہل کے اکسانے پر اونٹ کی اوجھڑی سجدہ کی حالت میں آپؐ کی پشت مبارک پر ڈال دی اور مشرکین زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ کسی نے آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ وہ فوراً دوڑی ہوئی آئیں۔ اور غلاظت

آپؐ کی پشت سے دور کی اور ان کافروں کو بد دعا دی۔ اس پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "بیٹی صبر سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت دے۔ یہ نہیں جانتے کہ ان کی بہتری کس چیز میں ہے۔"

ابولہب حضورؐ کا چچا تھا لیکن جب سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغِ دین شروع کی وہ اور اس کی بیوی اُمِ جمیل دونوں آپؐ کے دشمن ہو گئے۔ ابولہب نے یہ کہنا شروع کیا۔ "لوگو! (معاذ اللہ) یہ دیوانہ ہے۔ اس کی باتوں پر کان نہ دھرو۔" اس کی بیوی حضورؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتی تھی۔ کئی مرتبہ آپؐ کے تلوے لہولہان ہو گئے۔ مگر آپؐ نے نہایت صبر و استقلال کے ساتھ اس تکلیف کو برداشت کیا۔ کبھی بد دعا کے لیے ہاتھ نہ اٹھائے۔

ابولہب نے حضور اکرمؐ کے حقیقی چچا ہونے کے باوجود آپؐ سے دشمنی میں حد کر دی جسے اللہ تعالیٰ نے بے حد ناپسند فرمایا اور قرآن مجید میں ابولہب اور اُس کی بیوی کی ہلاکت کے لیے ایک پوری سُورۃ نازل ہوئی جو قرابت داروں کے حقوق کا خیال نہ رکھنے والوں کے لیے ایک سبق بھی ہے۔

دشمنانِ حق نے جب یہ دیکھا کہ ان کی تمام تدبیروں کے باوجود حق کا نور چاروں طرف پھیلتا جا رہا ہے۔ تو انھوں نے نبوت کے ساتویں برس محرم الحرام میں خاندان بنو ہاشم سے قطع تعلق کر لیا۔ جس کی رو سے تمام قبائل عرب کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ بنو ہاشم سے ہر طرح کا لین دین اور میل جول بند کر دیں اور ابولہب کے سوا پورا خاندان بنو ہاشم تین سال تک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور رہا۔ اس دوران انھوں نے اتنی تکلیفیں اٹھائیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر اس موقع پر "رحمۃ للعالمین" نے نہایت صبر و ضبط اور بڑی پامردی و استقامت سے ان حالات کا مقابلہ کیا۔ اس طرح آپؐ کے جان نثار صحابہ کرامؓ بھی رضائے الٰہی کی خاطر مصروفِ جہاد رہے اور اس راہ میں پیش آنے والی تمام تکلیفوں کو بے مثال صبر و استقامت اور پامردی سے برداشت کرتے رہے۔

عفو و درگزر

عفو و درگزر ایک بہترین اخلاقی وصف ہے۔ اس سے دشمن دوست ہو جاتے ہیں۔ اور دوستوں میں محبت بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لیے جو صفات پسند فرمائی ہیں۔ ان میں عفو و درگزر بھی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (سورہ آل عمران : 134)

ترجمہ :۔ "اور وہ مومن غصہ پی جانے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔"

رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کی غلطیوں کو تو معاف فرمایا ہی کرتے تھے۔ دشمنوں سے بھی عفو و درگزر کرتے تھے۔ ایک دفعہ رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وادی طائف کا قصد فرمایا کہ ان لوگوں کو دین اسلام کی دعوت دیں۔ طائف کے سرداروں نے آپؐ کی دعوت قبول کرنے کے بجائے نہایت تکلیف دہ سلوک کیا۔ اور آپؐ پر اتنے پتھر برسائے کہ جسم لہولہان ہو گیا اور جوتے خون سے بھر گئے۔ اس وقت جبرائیل امین علیہ السلام تشریف لائے اور اللہ کے حکم سے انھوں نے عرض کیا۔ "آپؐ حکم دیں تو طائف کے دونوں پہاڑوں کو آپس میں ملا دوں اور یہ لوگ پس کر نیست و نابود ہو جائیں۔" مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف یہ کہہ کر انھیں معاف فرمایا بلکہ دعا فرمائی۔ "اے اللہ ان کو ہدایت دے۔"

فتحِ مکہ کے موقع پر صحنِ کعبہ میں قریش کا اجتماع تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جنھوں نے دس سال تک رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو بے اندازہ تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ جس کی وجہ سے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی تھی۔ اب یہ لوگ مجبور و بے بس تھے۔ اور ڈر رہے تھے کہ نہ جانے ان سے کس قسم کا انتقام لیا جائے گا۔ رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی طرف توجہ کی اور پوچھا۔ "اے گروہ قریش تم جانتے ہو میں تمھارے ساتھ کیا برتاؤ کرنے والا ہوں؟" انھوں نے جواب دیا۔ "ہاں۔ آپؐ نیک برتاؤ کریں گے۔ کیونکہ آپؐ مہربان ہیں اور مہربان بھائی کے بیٹے

ہیں؟" آپؐ نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی اور سب کو معاف کر دیا۔

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (سورہ یوسف : 92)

ترجمہ:۔ تم پر آج کوئی الزام نہیں۔ اللہ تمھارا قصور معاف کرے۔ وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔

ذکر

ذکر کے معنی ہیں کسی کو یاد کرنا۔ دین کی اِصطلاح میں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہے۔ قرآن میں بار بار اللہ کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا حکم آیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (سورہ الاحزاب : 41)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو تم اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔

مومنوں کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (سورہ النور : 37)

ترجمہ:۔ وہ ایسے مرد ہیں جن کو نہ تجارت اللہ کی یاد سے غافل کرتی ہے نہ خرید و فروخت۔

اور ذکر کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (سورہ الرعد : 28)

ترجمہ:۔ اور معلوم رہے اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔

سب سے بہتر ذِکرِ الٰہی نماز ہے۔ اس میں دل، زبان اور پورا جسم اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بکثرت نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اتنی دیر تک نماز میں اپنے رب کے حضور کھڑے رہتے کہ پائے مبارک سوج جاتے۔ میں عرض کرتی یا رسُولؐ اللہ! آپؐ کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت لکھ دی ہے۔ پھر آپؐ یوں اتنی مشقت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا! کیا میں اللہ تعالیٰ کا

شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

کثرت سے یادِ الٰہی میں مشغول رہنا اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر نماز پڑھنا رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا اُسوۂ حسنہ ہے۔ آپؐ فرض نمازوں کے ساتھ نوافل کا خاص اہتمام کرتے تھے بخصوصاً صبح صادق سے پہلے رات کو اٹھ کر نمازِ تہجّد کا۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا

ترجمہ:۔ اور رات کے کچھ حصّے میں تہجد پڑھ لیا کیجیے جو آپ کے حق میں زائد چیز ہے شاید آپ کا پروردگار آپ کو مقام محمود دے۔ (بنی اسرائیل:79)

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے بہترین ذکر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه ہے۔ ذکر کے اور بھی بہت سے مسنون طریقے ہیں۔ جو احادیث کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ نماز کے بعد تینتیس تینتیس مرتبہ سبحان اللہ والحمدللہ اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر کہنا بھی ذکرِ مسنون ہے۔

سوالات

1۔ رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے رحمۃ للعالمین ہونے پر ایک نوٹ لکھیں۔

2۔ اخوت اسلامی کیا ہے؟ اور مسلمانوں کے درمیان رسُول اللہؐ نے کیسے اخوت قائم کی؟

3۔ مساوات کے بارے میں رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا اسوۂ حسنہ کیا ہے؟

4۔ رسُولؐ پاک کے عفو و درگزر پر ایک نوٹ لکھیں۔ یا آپؐ کے صبر و استقلال پر نوٹ لکھیں۔

5۔ ذکر سے کیا مراد ہے؟ ذکرِ الٰہی کی اقسام اور اس کے فضائل لکھیں۔

چوتھا باب

تعارف قرآن وحدیث

تعارف

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے جو کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے ان میں قرآن مجید آخری مکمل اور ابدی ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ اس کے فضائل وبرکات اور علوم واسرار بے حد وحساب ہیں۔

قرآن مجید کے اسماء

قرآن مجید کے اسماء کے بارے میں علماء کے کئی اقوال ہیں۔ جن میں سے کتاب البرہان کا بیان بھی ہے کہ قرآن کریم کے پچپن نام ایسے ہیں جو خود آیات قرآنیہ سے ماخوذ ہیں۔ ان میں سے چند اسماء مبارک مندرجہ ذیل فہرست میں مذکور ہیں:-

1- الکتاب : دُنیا کی تمام کتابوں میں کتاب کہلانے کا مستحق قرآن ہی ہے۔
2- الفرقان : سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے والی۔
3- نور : روشنی اور ہدایت دکھانے والی۔
4- شفاء : روحانی شفاء اور پیغام صحت۔
5- تذکرہ : عبرت ونصیحت کا سامان۔
6- العلم : یہ کتاب سراپا علم ومعرفت ہے۔
7- البیان : اس کتاب کی ہر تعلیم وضاحت سے پیش کی جاتی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کی چند صفتوں کا بھی بیان فرمایا ہے۔ مثلاً:

حکیم	حکمت والا
مجید	بزرگ

مبارک	بابرکت
العزیز	زبردست عزت والا
مبین	ہدایت کو واضح کرنے والا
کریم	کرامت اور بزرگی والا

اس کتاب کی خوبیوں کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ اس کے مضامین ومطالب کی کوئی حد نہیں۔ کوئی شخص بھی جس کے دل میں ہدایت کی سچی تڑپ ہو وہ اپنی فہم کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

فضائل قرآن مجید

قرآن مجید کے فضائل بہت سی آیات واحادیث میں مذکور ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ (سورہ یونس : 57)

ترجمہ :- اے لوگو! تمھارے پاس اپنے پروردگار کی طرف سے ایک پیغامِ نصیحت آچکا ہے۔ جو دلوں کی بیماریوں کا علاج اور مومنوں کے لیے ہدایت ورحمت ہے۔

قرآن مجید کی تلاوت باعثِ برکت اور موجبِ اجر وثواب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، کہ جو شخص قرآن کریم کا ایک حرف پڑھے اس کے لیے اس حرف کے عوض ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا اجر دس نیکیوں کے برابر ملتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آلم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف، میم ایک حرف ہے (گویا ایک لفظ میں تین حروف ہوئے جس کے بدلے میں تیس نیکیاں ملیں گی)

حضرت معاذ جُہنیؓ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "جس شخص نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا تو اس کے والدین کو روزِ قیامت

ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی روشنی سے بہتر ہوگی۔

قرآن مجید پر عمل دین و دُنیا کی کامیابی کا ذریعہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

"اے لوگو! تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے بہت سی قوموں کو عزت و سربلندی عطا کرتا ہے (ایمان و عمل کے ذریعے) اور بہت سوں کو (اس سے روگردانی پر) ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔"

وحی کیا ہے؟

وحی کے لغوی معنی خفیہ طور پر لطیف انداز میں اشارہ سے بات کرنے کے ہیں لیکن شریعت کی اِصطلاح میں وحی سے مراد وہ پیغامِ الٰہی ہے، جو اللہ تعالیٰ انبیاءِ کرام کو عطا کرتا ہے۔ حواس، عقل اور دیگر مادی ذرائع سے ملنے والے علم کے مقابلے میں وحی کے ذریعے حاصل ہونے والا علم زیادہ یقینی اور قطعی ہوتا ہے۔ تمام انبیائے کرام وَحیِ الٰہی کی رہنمائی میں اپنی اپنی امتوں کے لیے فریضہ تبلیغ و رسالت ادا کرتے رہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دین کی تکمیل ہو چکی ہے۔ قرآن مجید کی صورت میں آخری وحی اِلٰہی محفوظ ہو چکی ہے۔ جو روزِ قیامت تک ہدایت کے لیے کافی ہے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وحیِ آسمانی کا نزول اور نبوت و رسالت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو چکا ہے۔

نزولِ قرآن

قرآن کریم نزول سے پہلے بھی لوحِ محفوظ میں مکتوب تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (البروج)

ترجمہ:۔ یہ قرآن مجید ہے، لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا۔

پھر لیلۃ القدر میں جو رمضان المبارک میں ہے، یہ پورے کا پورا لوحِ محفوظ

سے آسمان دنیا پر نازل ہوا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (سورہ البقرہ : 185)

ترجمہ:۔ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔

اور اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (سورہ القدر : 1)

ترجمہ:۔ بے شک ہم نے اسے لیلۃ القدر میں اتارا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی حکمت اور فیصلے کے مطابق اس کا نزول حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر شروع ہوا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک چالیس سال کو پہنچی تو، آپؐ بکثرت سچے خواب دیکھا کرتے تھے۔ جو حرف بحرف پورے ہوتے تھے۔ ان دنوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر فاران نامی پہاڑ کے حرا نامی غار میں کئی کئی دن تنہائی میں گزارتے اور عبادت میں مصروف رہتے کہ اچانک ایک دن حضرت جبرئیل علیہ السلام ظاہر ہوئے اور آپؐ سے فرمایا۔

"اِقْرَاْ" (پڑھیے) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "مَآ اَنَا بِقَارِئٍ" (میں پڑھا ہوا نہیں ہوں) جبرئیل امین نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سینے سے لگا کر بھینچا اور پھر چھوڑ کر کہا "اِقْرَاْ" (پڑھیے) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ پھر جبرئیل علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور پھر سورہ علق کی پہلی پانچ آیات پڑھیں۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ بلکہ روزِ قیامت تک تمام انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کا عظیم بارِ امانت تھا۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ڈال دیا گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر اس کا بڑا اثر تھا۔ واپس آکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمُّ المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو، جب کچھ سکون ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام واقعہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سنایا۔ وہ آپؐ کے اطمینان کی خاطر آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی

ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ جو نہایت عمر رسیدہ اور تورات کے بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حالات سن کر کہا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتا تھا۔

اس کے بعد کچھ عرصے تک کوئی وحی نہ آئی۔ اسے "فَتْرَةُ الْوَحی" کا زمانہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد سورہ مدثر کی ابتدائی آیات سے وحی کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس کے بعد مسلسل قرآن مجید موقع اور محل کے مطابق تقریباً بیس سال تک نازل ہوتا رہا۔ اس طرح نزول وحی کا کل زمانہ **23** سال کے لگ بھگ ہے۔ عام طور پر تین تین، چار چار آیتیں ایک ساتھ اترتیں۔ بعض اوقات زیادہ آیتیں یا پوری سورت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہو جاتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کاتبانِ وحی کو بلا کر ہر وحی کو اس کی متعلقہ سورت میں لکھوا لیتے۔

مکّی اور مدنی سورتیں

جمہور مفسرین کے نزدیک مکی سورتوں سے مراد وہ سورتیں ہیں جو ہجرتِ نبوی سے پہلے مکی دور میں نازل ہوئیں۔ خواہ وہ حدودِ مکہ سے باہر ہی نازل ہوئی ہوں۔ جب کہ مدنی سورتوں سے مراد وہ سورتیں ہیں جو ہجرت کے بعد کے زمانے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رحلت کے زمانے تک نازل ہوئیں۔ مکی سورتوں کی تعداد **87** اور مدنی سورتوں کی تعداد **27** ہے۔ اس طرح سورتوں کی مجموعی تعداد **114** ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کا فرق

مکی اور مدنی سورتوں میں طرزِ بیان، معانی اور مضامین وغیرہ کے لحاظ سے کافی فرق ہے۔ مثلاً مکہ مکرمہ میں جو آیات اور سورتیں نازل ہوئی ہیں ان میں زیادہ تر اصول اور کلیات دین کا بیان ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت جیسے بنیادی عقائد پر زیادہ

زور دیا گیا ہے۔

توحید باری تعالیٰ کے اثبات اور شرک کے ابطال کے لیے غور و فکر اور کائنات اور خود وجودِ انسانی میں تدبّر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ بت پرستی اور شرک کی مذمت ایسے سادہ اور مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا بھی شرک سے متنفر ہو کر توحید کا پرستار بن جائے۔ سابقہ اقوام کے وہ قصے بار بار مختلف اسالیب میں بیان کئے گئے ہیں جن سے اہلِ عرب اچھی طرح واقف تھے اور ان اقوام کی زندگی میں عبرت و نصیحت کے واضح نشانات موجود تھے۔ آخرت اور موت کے بعد زندگی کو ذہن نشین کرانے کے لیے نہایت مؤثر انداز میں خطاب کیا گیا ہے۔ مکی سورتوں کے جملے چھوٹے اور نہایت دل نشین ہیں کہ سنتے ہی ذہن نشین ہو جائیں اور دل میں اتر جائیں۔

مدنی سورتوں کے مخاطب اہلِ کتاب اور مسلمان تھے۔ اس لیے ان میں ان کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر قرآن مجید کو سابقہ آسمانی کتابوں کا مؤید اور مصدق بتایا گیا ہے۔ سابقہ آسمانی کتابوں میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بارے میں مذکورہ پیشین گوئیاں یاد دلائی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ تورات و انجیل پر ایمان رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن پر پورا پورا ایمان لایا جائے۔

مدنی آیات اور سورتوں کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ ان میں اکثر و بیشتر عبادات و معاملات سے متعلق احکام، حلال و حرام، فرائض و واجبات اور ممنوعات و منہیات کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ غزوات و جہاد، مال غنیمت، خراج، جزیہ، میراث اور حدود و قصاص کے تفصیلی احکام بھی مدنی سورتوں کے خاص مضامین ہیں۔

حفاظت و تدوین قرآن مجید

قرآن مجید بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی آخری کتاب ہدایت ہے۔ حکمت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ اس سے قبل نازل ہونے والے صحیفوں کا مقررہ

زمانہ گزر جانے اور ان کے منسوخ ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن مجید کو نازل کیا جائے۔ جو قیامت تک انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا آخری، مکمل اور ناقابل تنسیخ ہدایت نامہ ہو۔ قرآن مجید کی اس اہمیت اور امتیازی شان کے پیش نظر ضروری تھا کہ اس کی حفاظت اور بقا کا پورا پورا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی اور قیامت تک کے لیے اس کے ایک ایک حرف کی حفاظت کا انتظام کر دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر:9)

ترجمہ:۔ بے شک ہم ہی نے قرآن کو اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرآن مجید کی حفاظت کے لیے جو انتظامات فرمائے گئے ان میں سے دو اہم طریقے صدری حفاظت اور کتابی حفاظت کے ہیں۔

صدری حفاظت (سینوں کے ذریعے)

صدر سینے کو کہتے ہیں۔ یہ قرآن مجید کی امتیازی شان ہے کہ اسے کتابی شکل میں محفوظ کرنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام کے سینوں میں محفوظ کر دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے قرآن مجید کو تیئس سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا موقع بموقع نازل کیا جاتا رہا۔ جیسے ہی کوئی سورت یا آیات نازل ہوتیں، صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد اسے حفظ کرنے میں لگ جاتی اور پھر وہ بار بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اعادہ کر کے یہ اطمینان حاصل کرتے کہ انھوں نے صحیح طریقہ سے اسے حفظ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی تلاوت نماز میں لازمی قرار دی گئی۔ قرآن مجید کی تعلیم و تعلم کے فضائل موقع بموقع بیان کیے جاتے تھے۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام مساجد میں قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام فرما دیا تھا۔ بعض مکانات[1] کو بھی

1 ۔ جیسے مدینہ میں مخرمہ بن نوفل کا مکان۔

مدارس قرآن مجید کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ علاوہ ازیں بعض صحابہ کرامؓ[2] کو معلم قرآن بنا کر دور دراز علاقوں میں بھیجا جاتا تھا۔ مسجد نبوی کے قریب صفہ (چبوترہ) درس قرآن کا زبردست مرکز تھا۔ جہاں سینکڑوں مسافر طلبہ روز و شب قرآن مجید کے حفظ اور درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ انہی اسباب کی بنا پر ابتدائے اسلام ہی سے ہر چھوٹے بڑے اور مرد و عورت کی توجہات کا اولین مرکز حفظ قرآن بن گیا تھا جس کی بدولت قرآن مجید ان کی رگ رگ میں رچ بس گیا۔ مومنین کی اسی صفت کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ (سورہ العنکبوت : [illegible])

ترجمہ:۔ بلکہ یہ (قرآن) تو آیتیں ہیں جو اہلِ علم کے سینوں میں محفوظ ہیں اور ہماری آیتوں کا انکار فقط ظالم لوگ ہی کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ عہد رسالت میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو مکمل قرآن مجید یا اس کے اکثر حصے زبانی یاد ہو گئے تھے اور یہی طریقہ ہمیشہ سے مسلمانوں میں چلا آ رہا ہے۔ مسلمان کسی جگہ بھی ہوں، اقلیت میں یا اکثریت میں، حفاظ قرآن کی ایک بڑی جماعت ان میں موجود رہتی ہے۔ اسی متواتر اور مسلسل حفظ و تعلیم کی بناء پر قرآن مجید کا ایک ایک حرف آج تک تحریف و تبدُّل سے محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔

کتابی حفاظت

عرب ظہور اسلام سے قبل امی تھے۔ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج بالکل نہ تھا۔ بلکہ ان کا سارا دار و مدار حافظہ اور روایت پر تھا۔ اس لیے ان میں نہ تو لکھنے والے موجود تھے، نہ لکھنے کے سامان کا کوئی انتظام تھا۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ نزولِ قرآن سے کچھ عرصہ قبل عرب لکھنے لکھانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ بعثت نبوی کے وقت

2 ۔ جیسے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم اور حضرت مصعبؓ بن عمیر وغیرہ۔

مکہ مکرمہ میں صرف 17 (سترہ) افراد ایسے تھے جو لکھنے کے فن سے واقف تھے۔ ان میں سے بعض ابتدائے اسلام ہی میں مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے شروع ہی سے قرآن مجید کی کتابت کا پورا انتظام وجود میں آچکا تھا۔ خود قرآن مجید کی اوّلین نازل شدہ آیات (سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیات) میں تعلیم بالقلم کو ایک بڑی نعمت قرار دیا گیا اور قرآن مجید کو ایک لکھی ہوئی کتاب کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا۔ سورہ طور کی ابتدائی آیات میں فرمایا گیا۔

وَالطُّوْرِ ٥ وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ٥

ترجمہ:۔ قسم ہے طور (پہاڑ) کی اور اس کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے کشادہ اوراق میں۔

چونکہ کاغذ کا رواج نہ تھا، اس لیے کتابت قرآن مجید کے لیے جو چیزیں استعمال کی گئیں ان میں اونٹ کے شانے کی چوڑی ہڈیاں، تختیاں، کھجور کی شاخوں کے ڈنٹھل، باریک سفید پتھر کے ٹکڑے، کھال یا پتلی جھلی کے ٹکڑے اور چمڑے کے ٹکڑے وغیرہ شامل تھے۔ جونہی کوئی سورہ نازل ہوتی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر حکم فرماتے کہ اس آیت کو اس سورت میں درج کرو جس میں فلاں بات کا ذکر ہے۔ اس طرح نازل شدہ آیات کے صحیح مقام سے آگاہ فرما کر اس کی کتابت کروا لیتے تھے۔ صحابہ کرامؓ حفظ کے علاوہ اس قسم کے صحیفے اپنے پاس رکھتے اور تلاوت کے لیے سفروں میں ساتھ لے جایا کرتے۔

اگرچہ قرآن مجید کی تمام آیات کریمہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کاتبوں سے لکھوائی تھیں۔ تاہم انھیں ایک مصحف میں جمع نہیں فرمایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید کی کئی سورتوں کا نزول بیک وقت جاری رہتا، نزول کی ترتیب اس طرح نہیں تھی جس طرح آج قرآن مجید ہمارے پاس لوح محفوظ کی ترتیب کے مطابق موجود ہے۔ اسی لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نزول قرآن کے زمانے میں ایک مصحف میں کتابی شکل میں آیات مبارکہ کو جمع نہیں فرمایا۔ البتہ ہر سورت اور آیت کا

صحیح مقام بنا کر اس کے مطابق حفظ اور مختلف اشیاء پر کتابت کروا کر امت کے حوالے کر دیا۔

جمع و تدوین قرآن حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں

جس طرح قرآن مجید حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے الفاظ اور ترتیب کے ساتھ آپؐ کی حیات طیبہ میں صحابہ کرامؓ کے سینوں میں محفوظ ہوا۔ اسی طرح نزول کی تکمیل اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے فوراً بعد کتابی صورت میں جمع ہونے کا انتظام بھی اللہ تعالیٰ نے فرما دیا۔ اس مہم کی طرف سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی توجہ اس وقت مبذول ہوئی جب جنگ یمامہ میں کئی سو حفاظ و قرّاء شہید ہو گئے۔ اس پر انھوں نے خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ "اِنِّیْ اَرٰی اَنْ تَاْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْآنِ"

ترجمہ:۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن مجید کو کتابی صورت میں جمع کرنے کا حکم فرمائیں۔

شروع میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس بار عظیم کو اٹھانے کے حق میں نہ تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ایسا نہیں کیا تو ہمارے لیے ایسا کام کرنا کب درست ہو سکتا ہے۔ مگر بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بار بار توجہ دلانے سے ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ کتابت قرآن مجید تو عین سنت نبوی ہے اور یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود مختلف اشیاء پر قرآن مجید کی کتابت کروا چکے ہیں۔ اس لیے اس کا ایک مصحف میں جمع کرنا عین منشاء نبوی کے مطابق ہے۔

جب اکابر صحابہ رضی اللہ عنہ اس رائے پر متفق ہو گئے تو کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس خدمت کے انجام دینے پر مامور کیا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ اگرچہ حافظ قرآن تھے اور ان کے پاس اپنا مصحف بھی موجود تھا۔ تاہم فقط یادداشت کی بنیاد پر قرآن مجید کو جمع کرنے کی بجائے طریقہ یہ مقرر کیا گیا کہ جن لوگوں کے پاس مختلف

نوشتے تھے۔ ان سے منگوا کر دو گواہوں کے سامنے یہ شہادت لی جاتی کہ یہ نوشتہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روبرو لکھا گیا ہے۔ کتابت قرآن کے لیے حضرت زید بن ثابت کی سربراہی میں 75 صحابہ کرامؓ کی مستقل کمیٹی بنائی گئی تھی جن میں 25 مہاجر اور 50 انصاری صحابہ شامل تھے۔ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کی فصاحت اور لہجہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشابہ تھا۔ اس لیے املا کا کام ان کے ذمے ڈالا گیا۔ اس طرح اجماع صحابہ سے قرآن مجید کا نسخہ تیار کر کے اُمّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں رکھ دیا گیا۔

جمع قرآن حضرت عثمانؓ کے عہد میں

عرب کے مختلف قبائل، لہجے اور بعض لغات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے قدرے مختلف تھے۔ ہجرت کے بعد جب مختلف عرب قبائل مشرف باسلام ہونے لگے تو لغات اور لہجوں کے اختلاف کی وجہ سے ان کے لیے قریشی لہجے میں قرآن کی تلاوت کرنا دشوار تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے مختلف احرف (لہجوں) میں قرآن مجید پڑھنے کی اجازت دے دی گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ اُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنْهُ'

ترجمہ:۔ بے شک یہ قرآن سات احرف (لہجوں) سے نازل ہوا ہے۔

پس ان میں سے اس لہجہ سے پڑھو جو تمہارے لیے آسان ہو۔

اس طریقے پر نزولِ قرآن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی کے اواخر تک ہوتا رہا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اسلامی خلافت کی حدود وسیع تر ہو گئیں تو مختلف اَحْرُف سے قرآن مجید کی قرأت سے بعض اوقات الجھنیں اور غلط فہمیاں پیدا ہونے لگیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کبار صحابہ کو جمع کر کے اس خطرے سے آگاہ کیا اور فرمایا۔

"اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیو! تم جمع ہو کر لوگوں کے لیے ایک رہنما اور

امام مصحف لکھو"۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت کو حکم دیا کہ وہ دوبارہ صحابہ کرامؓ کے متفرق نوشتوں سے قرآن کریم کو جمع کریں اور جس جگہ لہجے کا اختلاف ہو وہاں لغت قریش کو معیار مانا جائے۔ کیونکہ قرآن لغت قریش پر ہی نازل ہوا۔ اس طریق پر جب مصحف کی کتابت 24 ھ کے اواخر اور 25 ھ کے اوائل کے زمانہ میں مکمل ہو گئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد کا جمع کردہ مصحف منگوایا اور اس سے لفظ بلفظ تقابل اور اطمینان حاصل کر لینے کے بعد اس کی پشت پر یہ عبارت لکھی گئی۔

هٰذَا مَا اَجْمَعَ عَلَيْهِ جَمَاعَةٌ مِّنْ اَصْحَابِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ

ترجمہ: یہ وہ نسخہ قرآن ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کی جماعت نے اجماع و اتفاق کیا ہے۔

اس مصحف کو "مصحف امام" کا نام دیا گیا اور اس کی سات نقلیں کرا کر مکہ مکرمہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ اور مدینہ منورہ جیسے مرکزی مقامات پر رکھوا دی گئیں۔ اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی انتھک محنت کے باعث قرآن مجید ایک ہی لہجے اور لغت پر ساری دُنیا میں رائج ہوا۔

قرآن مجید کی خوبیاں

قرآن مجید میں ایسی خوبیاں موجود ہیں جن کے سبب یہ کتاب زندہ جاوید بن گئی ہے۔ ان تمام خوبیوں کا شمار ناممکن اور محال ہو گا۔ تاہم چند خوبیوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

1۔ قرآن مجید ایک سچی کتاب ہے۔ اس کی دعوت اور پیغام بھی سچائی سے بھرپور ہے۔ اس کے دلائل نہایت مضبوط اور مستحکم ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ (سورہ ہود: 1)

ترجمہ :- یہ کتاب ہے کہ جانچ لیا ہے اس کی باتوں کو پھر کھولی گئی ہیں
ایک حکمت والے خبردار کے پاس سے۔
چونکہ دلائل نہایت مضبوط ہیں اور سچائی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اس لیے
تضاد سے پاک ہیں۔ اس کے مضامین میں ذرہ بھر بھی اختلاف نہیں۔ ارشاد باری
تعالیٰ ہے۔

لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا "

(سورہ النساء : 82)

ترجمہ :- اگر یہ ہوتا کسی اور کا سوائے اللہ کے تو ضرور پاتے اس میں
بہت تفاوت۔

2 ۔ اس کتاب نے ان افراد اور اقوام کی کامیابی کی ضمانت دی ہے، جو سچے دل سے اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے لیے یہ کتاب اس جہان میں بھی شرف و امتیاز کا وعدہ کرتی ہے۔ اس حقیقت کو حضرت عمرؓ نے یوں ارشاد فرمایا ہے۔

"اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے کتنی ہی قوموں کو بلندی بخشے گا اور کتنوں کو پست کرے گا"

(صحیح مسلم)

حضرت عمرؓ ہی کی زندگی کو لیجیے۔ اس کتاب ہدایت کا اثر تھا، جس نے حضرت عمرؓ کی زندگی کو یکسر بدل دیا۔ وہ عمرؓ جو اپنے باپ خطاب کی بکریاں چرایا کرتے تھے اور ان کے باپ انھیں جھڑکا کرتے تھے اور یہ قوت و عزم میں قریش کے متوسط لوگوں میں سے تھے۔ وہی عمر اسلام قبول کر لینے کے بعد تمام عالم کو اپنی عظمت و صلاحیت سے متحیر کر دیتے ہیں اور ایک ایسی اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالتے ہیں، جو قیصر و کسریٰ کی حکومتوں پر حاوی ہے۔ تدبیر سلطنت میں ہمیشہ کے لیے وہ رہنما اصول مقرر کرتے ہیں جن پر ساری دنیا فخر کرتی ہے۔ اتنی بڑی سلطنت کے سربراہ ہونے کے باوجود ورع و تقویٰ میں بے مثل ہیں۔ جو شخص جس قدر اس

کتاب سے قریب ہوگا اسی قدر اسے شرف و امتیاز نصیب ہوگا اور جس قدر اس کتاب کی تعلیمات سے روگردانی کرے گا اسی قدر وہ ذلت و خواری کا شکار ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آج بھی مسلمان مل کر قرآن کی راہ پر چلیں تو وہ عزت و شرف یقیناً آج بھی انھیں نصیب ہو سکتا ہے۔

3 - تربیت و تزکیہ کے لحاظ سے اس کتاب میں بلا کی خوبی ہے۔ اس کی تربیت سے انسانی قلب و دماغ جذبات و خواہشات، رجحانات، میلانات اور سیرت و کردار کا بخوبی تزکیہ ہوتا ہے۔ جس کی بدولت انسان اخلاقی فضائل اپنے اندر پیدا کرتا ہے اور پھر اس کی ہر بات دل میں اتر جاتی ہے۔ اس کی تلاوت سے جہاں قلب میں خشوع و خضوع پیدا ہوتا ہے وہاں عزم و یقین کی دولت بھی نصیب ہوتی ہے۔

قرآن مجید کی تاثیر

قرآن مجید چونکہ کلام الٰہی ہے اس لیے اس میں پڑھنے والوں کے لیے بلا کی تاثیر رکھ دی گئی ہے۔ اس تاثیر کا اندازہ قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتا ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

(سورہ الحشر : 21)

ترجمہ :- اگر ہم اتارتے یہ قرآن ایک پہاڑ پر تو تو دیکھ لیتا کہ وہ دب جاتا، پھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے۔

یہ اسی تاثیر کا سبب ہے کہ ایک مومن اس کی تلاوت کے دوران میں ایک عجیب کیفیت اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ یہی دراصل ایمانی کیفیت ہے۔ جو تعلق باللہ میں استواری اور قرآنی تعلیمات کو اپنے اندر جذب کرنے کا باعث بنتی ہے حدیث میں ہے کہ حضورﷺ صحابہ سے قرآن مجید سنتے اور اس موقع پر آپ ﷺ پر رقت کی عجیب پر کیفیت حالت طاری ہو جاتی۔ اس بارے میں ایک حدیث ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ حضور نے مجھے فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ میں نے عرض کی اے خدا کے رسول میں آپ کو قرآن سناؤں حالانکہ آپؐ پر قرآن نازل ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا میں اوروں سے قرآن سننا پسند کرتا ہوں، چنانچہ میں سورت نساء پڑھنے لگا۔ جب میں اس آیت پر پہنچا۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا

(سورہ النساء : 41)

ترجمہ: پھر کیا حال ہوگا جب بلادیں گے ہم ہر امت میں سے احوال کہنے والا اور بلادیں گے تجھ کو ان لوگوں پر احوال بتانے والا۔

تو آپؐ نے فرمایا! اب بس کرو۔ میں نے آپؐ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو آپؐ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ قرآن کی تلاوت کے دوران میں صحابہؓ کی کیا کیفیت ہوتی تھی۔ اس کے بارے میں مفسر ابن کثیر اپنی تفسیر میں یوں لکھتے ہیں "وہ نہ چیختے تھے اور نہ تکلفات سے کام لے کر کسی مصنوعی کیفیت کا مظاہرہ کرتے تھے، بلکہ وہ ثبات وسکون، ادب وخشیت میں اس قدر ممتاز تھے کہ ان صفات میں ان کی کوئی برابری نہ کر سکا۔"

(تفسیر ابن کثیر جلد 4، صفحہ 51)

مومن کا دل تلاوت قرآن کے وقت جہاں کانپ اٹھتا ہے اس کے ساتھ اس کے دل میں سکون کی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے۔ گویا بدن اور دل کے نرم پڑنے کا مطلب ہی سکون کا حاصل ہو جانا ہے۔ جو رحمت الٰہیہ کے نزول کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ تلاوت قرآن کے وقت سکون ورحمت کا نزول ہوتا ہے، اس لیے اس وقت رحمت الٰہیہ کا امیدوار بننے کے لیے قرآن مجید کو توجہ اور خاموشی سے سننے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ

(سورہ الاعراف : 204)

ترجمہ: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور

چپ رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار یہی لوگ ہیں جو قرآن مجید کو توجہ سے سنتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے قرآن ان کے دلوں میں اتر جائے۔

حدیث اور سُنّت

حدیث کے لغوی معنی خبر یا بات چیت کے ہیں۔ شریعت اسلامی کی رو سے حدیث اس خبر کا نام ہے جس کے ذریعے ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی قول، فعل یا تقریر معلوم ہو۔ اس طرح حدیث کی تین قسمیں بنتی ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

حدیث قولی وہ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی بات کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کچھ فرمایا ہو یا اس میں کسی معاملے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دی ہوئی زبانی ہدایات کا تذکرہ ہو۔

حدیث فعلی وہ ہے جس میں راوی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اختیار کردہ کوئی عمل اور طریقہ بیان کیا ہو۔

حدیث تقریری سے مراد وہ اَحادیث ہیں جن میں ایسے امور کا تذکرہ ملے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے واقع ہوئے ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر خاموشی اختیار فرمائی ہو، اس لیے کہ اگر اس معاملے میں کوئی بات ممنوع یا قابل وضاحت ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور اس بارے میں رہنمائی فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان اُمور پر خاموش رہنا اس کی تصدیق کے مترادف ہے۔

سُنّت کے لفظی معنی طریقے اور راستے کے ہیں خواہ اچھا ہو یا بُرا۔ اِصطلاحِ شریعت میں سُنّتِ رُسول کے معنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیار کردہ اور ہدایت کردہ طریقے کے ہیں۔ جمہور محدثین کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جملہ اقوال، افعال، تقریرات، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق جلیلہ، مغازی حتیٰ کہ بعثت

سے قبل کے احوال بھی سُنّت کے ضمن میں آتے ہیں۔

حدیث یا سُنّت کی شرعی حیثیت

شریعت اسلامی کے چار بُنیادی مآخذ کتاب اللہ، سُنّت رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم، اِجماع اور قیاس ہیں ان میں سُنّت رسُول صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوسرا بُنیادی مقام حاصل ہے۔ حدیث "وحی" کی وہ قسم ہے جو اللہ تعالیٰ نے الفاظ وعبارات کے بغیر رسُول صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے قلب مبارک پر نازل فرمائی۔ اس امر پر سب مسلمانوں کا اجماع ہے کہ حدیثِ نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی پیروی واجب اور خلاف ورزی حرام ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار نصوص وآیات وارد ہوئی ہیں۔ یہاں اِختصار کی غرض سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: 7)

ترجمہ:۔ اور ہمارے رسُول تمھیں جو کچھ دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے باز رہو۔

اس آیت مبارک میں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے جُملہ اَحکام وہدایات کو قبول کرنے اور منہیات سے رک جانے کا واضح حکم دیا گیا ہے۔ گویا حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے جُملہ اَحکام عین رضاءِ الٰہی کے مترادف ہیں۔ اسی کی مزید توضیح ایک دوسری آیت مبارکہ سے ہوتی ہے۔ ارشاد ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (سورہ النساء 86)

ترجمہ: جس نے رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر ہر قسم کی لغزش اور خطاء سے معصوم ہوتا ہے۔ تشریعی امور

میں پیغمبر کا ہر قول، عمل اور اشارہ من جانب اللہ ہوتا ہے۔ اس میں اس کی ذاتی خواہش یا وسوسہ کا احتمال نہیں ہوتا۔ اور اسے پوری طرح تائیدِ ربانی اور تصدیقِ الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (سورہ النجم: 3)

ترجمہ:۔ وہ (ہمارا رسُول صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی مرضی وخواہش سے کچھ نہیں بولتا۔ وہ تو صرف وہی کچھ کہتا ہے جو انھیں "وحی" کے طور پر دیا جاتا ہے۔

حدیث شریعت کا دوسرا ماخذ اور قرآن مجید کی تفسیر اور عملی تعبیر ہے پیغمبر صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا کام فقط آیات قرآنیہ کا سنا کر یاد کروا دینا ہی نہیں، بلکہ پیغمبر کے فرائضِ منصبی میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ آیات اِلٰہیہ کی موقع محل کے مطابق توضیح وتشریح کرے مختلف اِستعداد کے لوگوں کو ان کی ذہنی وعلمی سطح کے مطابق اس کے اسرار ورموز سے آگاہ کرے۔ پھر ان کو اس کے مطابق عمل کی تربیت دے، اور ان کو اس راہ پہ چلنے کے لیے خود عملی نمونہ دکھلائے۔ تاکہ وہ اَحکامِ الٰہی کی تعمیل کے سلسلے میں افراط وتفریط میں نہ پڑ جائیں۔ نیز ان کے نفوس کا اس طرح تزکیہ کرے کہ اتباعِ شریعت ان کی فطرتِ ثانیہ بن جائے اور اس کے ہدایت یافتہ شاگرد خود دوسروں کے لیے ہدایت کے تارے بن جائیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے انہی فرائض کا تذکرہ مندرجہ ذیل آیات میں کیا گیا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

(سورہ الجمعہ: 2)

ترجمہ:۔ اللہ وہی ہے جس نے اَن پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسُول مبعوث فرمایا جو ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان (کے نفوس) کو سنوارتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے

پہلے صریح گمراہی میں تھے۔

قرآن کریم میں بہت سے امور مثلاً عبادات، حلال وحرام اور معاملات وغیرہ میں مجمل اصول وقواعد بتا دیے گئے ہیں اور ان کی تفصیل اور توضیح کا کام پیغمبر کے ذمے ڈال دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (سورہ النحل: 44)

ترجمہ: ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے لیے اس چیز کی وضاحت کریں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔

اسی طرح بعض بڑے جرائم اور حدود کے بارے میں تو قرآن مجید نے سزائیں بتلادیں تاہم بقیہ جرائم کی تعزیرات کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء:59)

ترجمہ: اگر تمھارا کسی معاملہ میں آپس میں تنازع ہو تو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرو۔

اسی طرح مختلف متنازعہ امور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قاضی وحکم بنانے اور ان کا فیصلہ دل وجان سے تسلیم کرنے کو ایمان کا بنیادی تقاضا بتایا گیا ہے۔

سورہ النساء آیت 65 میں ارشاد ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

ترجمہ: تیرے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تنازعات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم اور فیصلہ کنندہ نہ بنائیں اور پھر جو فیصلہ آپ کریں۔ اس کے بارے میں اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سرِ تسلیم خم کر دیں۔

خلاصہ یہ کہ احادیث نبویہ شریعت کے بنیادی ماخذ اور قرآن مجید کی تفسیر وتشریح

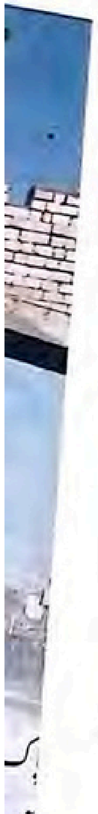

کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے بغیر قرآن مجید اور احکام الٰہیہ کا تفصیلی علم ناممکن ہے اس لیے حدیث پر عمل واجب اور موجب فلاح دارین ہے اور اس کا انکار کفر کے مترادف ہے۔

تدوین حدیث

ظہور اسلام کے وقت کتابت اور لکھنے پڑھنے کا رواج عربوں میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ گنے چنے افراد فن کتابت سے واقف تھے، جن میں سے اسلام قبول کرنے والے حضرات سے قرآن مجید کی وقتاً فوقتاً نازل ہونے والی آیات کی کتابت کی خدمت لی جاتی تھی جب کہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلے میں عام طور پر زبانی روایت اور قوت حافظہ کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔

جب ہم ذخیرہ احادیث پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں دو قسم کی احادیث ملتی ہیں۔ ایک تو وہ جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابت حدیث سے منع کر دیا تھا اور دوسری قسم وہ ہے جس میں کتابت حدیث کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے لکھے گئے احکام وفرامین بھی ملتے ہیں۔

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شروع میں حدیث کے سلسلے میں کتابت سے ممانعت کا حکم کئی مصالح اور حکمتوں پر مبنی تھا۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ کتابت کا فن عام نہ تھا اس لیے حفظ حدیث پر زور دیا گیا تاکہ زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں اور ان کی قوت حافظہ بھی ضائع ہونے کی بجائے مزید ترقی کرے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید کی طرف توجہ زیادہ رہے تاکہ یہ دلوں میں راسخ ہو جائے اور قرآن مجید کے ساتھ حدیث یکجا لکھنے کی اس لیے بھی ممانعت کی گئی کہ قرآن اور حدیث کے الفاظ آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں چونکہ سامان کتابت زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا اور دائرہ کتابت چند افراد تک محدود تھا۔ اس لیے قرآن وحدیث کے الفاظ کے التباس کا خدشہ ہو سکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”قرآن کے سوا مجھ سے سن کر کچھ نہ لکھو، جس نے قرآن کے سوا کوئی چیز

مجھ سے لکھی ہوا سے مٹا دے ۔ (صحیح مسلم بروایت ابو سعید خدریؓ)

تاہم یہ احکام درج بالا مصالح کے تحت وقتی طور پر دیے گئے تھے ۔ جب حالات بہتر ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابتِ حدیث کی اجازت دے دی ۔ جس کی متعدد مثالیں موجود ہیں ۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ شروع میں صرف حفظ حدیث کے کے قائل تھے مگر بعد میں انھوں نے اپنی تمام مرویات کو تحریری طور پر محفوظ کر لیا تھا ۔ جب کسی قسم کا شک و شبہ پیدا ہوتا تو اس مجموعے سے اس کی تصدیق کرتے ۔ عمروؓ بن امیہ کا بیان ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے سامنے ایک حدیث پر گفتگو ہوئی تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور ہمیں احادیث کی کتابیں دکھائیں اور کہا دیکھو وہ حدیث میرے پاس لکھی ہوئی ہے ۔ بہت سے صحابہ کرامؓ کے ذاتی مجموعہ ہائے احادیث کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے معاہدات ، صلح نامے ، احکامات اور خطوط وغیرہ بھی ضبط تحریر میں لائے گئے ۔ مثلاً صلح حدیبیہ کا معاہدہ ، شاہان مصر ، روم و ایران کے نام خطوط یا فتح مکہ کے بعد جو خطبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا تھا ۔ ابو شاہ یمنی کی درخواست پر انھیں لکھوا دیا تھا ۔ حاکم یمن عمرو بن حزام کو تقرری کے وقت ایک تحریر لکھائی تھی جس میں فرائض ، صدقات ، طلاق ، صلوٰۃ وغیرہ کے متعلق ضروری احکام تھے ۔

عہد صحابہ کے بعد تابعین کے دور میں بھی عام طور پر زیادہ توجہ حفظ حدیث کی جانب رہی ۔ تاہم چونکہ لکھنے کا فن عام ہو رہا تھا اس لیے اکثر لوگ اپنی ذاتی سعی سے بعض نوشتے لکھنے لگے تھے ۔ یہ دور پہلی صدی ہجری کے اواخر تک جاری رہا ۔

یہ صحابہ اور اکابر تابعین کا دور تھا ۔ اس کے بعد دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب ۹۹ ھ میں حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ بنے ۔ اس وقت تقریباً تمام صحابہؓ دنیا سے کوچ کر چکے تھے ۔ بزرگ تابعین بھی اٹھتے جا رہے تھے اس لیے آپ رضی اللہ عنہ نے حفاظت حدیث کی نیت سے تمام کے نام فرامین بھیجے کہ احادیث نبویہ کو تلاش کر کے جمع کر دیا جائے ۔ یہ حکم بھی دیا کہ احادیث کے ساتھ خلفاء راشدین

کے آثار کو بھی جمع کر لیا جائے ۔ تاکہ احکامِ شریعت پر عملدر آمد کی مثالیں بھی محفوظ ہو جائیں ۔

آپ کے ان فرامین کا بہت اچھا نتیجہ نکلا اور جن لوگوں نے اس کا اثر قبول کیا ان میں حجاز و شام کے مشہور عالم محمد بن مسلم بن شہاب زہری (متوفی 124ھ) بھی تھے ۔ انھوں نے دن رات محنت کر کے احادیث کی ایک کتاب مرتب کی جس کی نقلیں کروا کر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے مختلف بلاد میں بھجوائیں ۔ ان کے علاوہ مدینہ میں سعید بن المسیب ، کوفہ میں امام شعبی اور شام میں مکحول جیسے علماء موجود تھے ۔ انھوں نے حدیث کی تدوین و اشاعت میں زبردست حصہ لیا ۔ ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اس کام کو مزید وسیع کر دیا ۔ اس کے بعد احادیث کی چھان پھٹک ، فقہی ترتیب اور تدوین و ترتیب کے کام پر پورے عالم اسلامی میں توجہ دی گئی اور کئی ایک ضخیم و مستند اور منظم و مرتب کتب حدیث وجود میں آئیں جن میں صحاح ستہ زیادہ مشہور ہوئیں جو مدتوں سے درسی کتابوں کے طور پر عالم اسلامی میں مستعمل ہیں اور اس کی شرح و حواشی اور تنقیح و تشریح کے سلسلے میں ہر دور میں گراں قدر خدمات انجام دی گئی ہیں ۔

صحاح ستہ (حدیث کی چھ مشہور کتابوں) اور اصول اربعہ اور ان کے مصنفین کی فہرست درج ذیل ہے :-

1 - صحیح بخاری ، امام ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ (194 تا 256 ہجری)

2 - صحیح مسلم - امام مسلم بن حجاج بن مسلم قشیری - (ف 261 ہجری)

3 - جامع الترمذی - امام ابو عیسٰی ، محمد بن عیسٰی الترمذیؒ (ف 279 ہجری)

4 - سنن ابی داؤد - امام ابو داؤد سلیمان بن اشعثؒ (ف 275 ہجری)

5 - سنن النسائی - امام ابو عبد الرحمٰن احمد بن علی النسائیؒ (ف 303 ہجری)

6 - سنن ابن ماجہ - امام ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینیؒ (ف 273 ہجری)

اُصولِ اَربعہ ۔ مندرجہ ذیل چار کتابیں فقہ جعفریہؒ کی مستند ترین ذخائر حدیث ہیں۔

1- الکافی -ابوجعفر مُحمّد بن یعقوب الکلینیؒ (ف 339 ہجری)
2- مَن لَایَحضُرُہُ الفَقِیہُ -ابوجعفر مُحمّد علی بن بابویہ قمیؒ (ف 381 ہجری)
3- اَلاِستِبصَارُ -ابوجعفر مُحمّد بن الحسن الطوسیؒ (ف 460 ہجری)
4- تَہذِیبُ الاَحکَام ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسیؒ (ف 460 ہجری)

منتخب آیات

یَآ اَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ قُولُوا قَولًا سَدِیدًا ۝ یُّصلِح لَکُم اَعمَالَکُم وَیَغفِر لَکُم ذُنُوبَکُم ؕ وَمَن یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُولَہٗ فَقَد فَازَ فَوزًا عَظِیمًا ۝ (سورہ الاحزاب ۷۰-۷۱)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے اور کہو بات سیدھی کہ سنوار دے تمھارے کام اور بخش دے تم کو تمھارے گناہ اور کوئی کہنے پر چلا اللہ کے اور اس کے رسول کے اس نے پائی بڑی مُراد۔

تشریح:۔ ان آیات کے شروع میں دو باتوں یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور درست بات کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تقویٰ کے معنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے دین و شریعت کے احکام کی بجا آوری ہے۔ دوسری تاکید یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ درست بات کہے۔ جھوٹ وغیرہ کا اس میں احتمال نہ ہو۔ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ وہ تمھارے اعمال درست کر دے گا اور اس کے ساتھ ہی آخرت کی مغفرت کا وعدہ بھی فرمایا گیا ہے۔

لَقَد کَانَ لَکُم فِی رَسُولِ اللّٰہِ اُسوَۃٌ حَسَنَۃٌ ۔ (سورہ الاحزاب، ۲۱)

ترجمہ:۔ تم لوگوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی ہی بہترین نمونہ ہے۔

تشریح:۔ یہاں عام ضابطے کے طور پر مسلمانوں سے ارشاد فرمایا گیا کہ تمھیں روزمرہ کے کاموں میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیئے۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سب مسلمانوں کے لیے نمونہ ہیں۔ جو شخص اپنی زندگی میں آپ کو نمونہ بنا کر جس قدر محاسن اپنے اندر پیدا کرے گا۔ اسی قدر اللہ کے ہاں مقبول ہو سکتا ہے۔ دنیا و آخرت کی تمام سعادتیں صرف آپؐ کی ذات کی اتباع، اطاعت اور تقلید سے وابستہ کر دی گئی ہیں۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (سورہ آلِ عمران۔ ۱۰۳)

ترجمہ:۔ اور مضبوط پکڑو رسّی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو۔

تشریح:۔ اس آیت میں اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے یعنی اس کے احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور مسلمانوں میں تفرقہ بازی وغیرہ سے منع کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے، جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے احکام چھوڑ دیں۔ پھر عداوت، خود غرضی، حسد، کینہ اور بغض جیسی برائیاں پیدا ہو کر مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے کے خلاف کر دیتی ہیں اس کے برعکس اگر مسلمان اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اپنا رہبر بنائیں۔ اس کے احکام پر عمل کریں تو سب برائیوں کی جگہ محبت، دوستی، اخلاص، مروّت، ہمدردی جیسی بھلائیاں پیدا ہوں گی۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (سورہ الحجرات۔ ۱۳)

ترجمہ:۔ تحقیق تم سے اللہ کے ہاں وہی زیادہ عزت کا مستحق ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔

تشریح:۔ سیاق و سباق کے لحاظ سے آیت کا یہ ٹکڑا اس مقام پر وارد ہوا ہے جہاں مسلمانوں کو عیب جوئی اور طعن و تشنیع سے منع کیا گیا ہے۔ بسا اوقات برائیوں کا ارتکاب آدمی اس وقت کرتا ہے جب وہ اپنے آپ کو بہت بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھ لے۔ اس موقع پر ارشادِ ربّانی کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا چھوٹا بڑا یا معزز و حقیر ہونا، ذات پات یا خاندان و نسب کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ قرآن کی زبان میں جو شخص جس قدر نیک خصلت، مؤدّب اور پرہیزگار ہو اسی قدر اللہ کے ہاں معزز و مکرّم ہے۔ نسب کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ سب انسان آدم و حوّا کی اولاد ہیں۔ اس واسطے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا۔ کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر فضیلت نہیں۔ سُرخ کو سیاہ اور سیاہ کو سُرخ پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ

لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔ (سورہ آلِ عمران۔ ۱۹۰)

ترجمہ:۔ بے شک آسمان اور زمین کے بنانے اور رات اور دن کے آنے جانے میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔

تشریح:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں کا ذکر فرما کر عقل مندوں کو اس جہاں کے کارخانے پر غور کرنے کی دعوت دی ہے تاکہ اس غور و فکر سے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ان کے لیے آسان ہو جائے۔ قرآن غور و فکر کی دعوت دیتا ہے لیکن غور و فکر ایسا چاہیے جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب ہو۔ اس کے برعکس ایسا غور و فکر جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ سے دُوری ہو اور انسان یہ سمجھ لے کہ اس جہاں کا کارخانہ خود ہی چل رہا ہے۔ ایسے لوگ قرآن کی زبان میں عقلمند نہیں بلکہ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی یقین کرے کہ یہ سارا مربوط و منظم سلسلہ ضرور کسی ایک مختارِ کُل اور قادرِ مطلق فرمانروا کے ہاتھ میں ہے۔ جس نے اپنی عظیم قدرت و اختیار سے ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی حدبندی کر دی ہے۔ کسی چیز کی مجال نہیں کہ اپنے دائرہ عمل سے باہر قدم نکال سکے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (سورہ آلِ عمران، ۹۲)

ترجمہ:۔ تم ہرگز زندگی میں کمال حاصل نہ کر سکو گے جب تک اپنی پیاری چیز میں سے خرچ نہ کرو۔

تشریح:۔ عموماً انسان مال و دولت سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اس محبت کو کمزور کرنے کے لیے قرآن نے یہ رہنمائی فرمائی کہ اللہ کی خوشنودی کی خاطر مال و دولت میں سب سے پیاری چیز اس کی راہ میں خرچ کرو تاکہ ایک طرف اللہ کی محبت بڑھے اور اس کے ساتھ یہ یقین بھی پیدا ہو کہ مال و دولت اللہ کی دی ہوئی ہے۔ اسی کی راہ میں خرچ ہونی چاہیے اور اس عمل کو نیکی شمار کیا گیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ عام طور پر اپنی ذاتی شہرت اور بڑائی کے لیے مال خرچ کرتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ قرآن نے جہاں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی تعلیم دی ہے وہاں ذاتی اغراض کے تمام پہلو رد کر دیے ہیں۔

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

(سورہ الحشر۔ ۷)

ترجمہ:۔ اور جو دے تم کو رسولؐ سو لے لو اور جس سے منع کرے اسے چھوڑ دو۔

تشریح:۔ آیت کا مفہوم عام ہے کہ حضور جو کام کرنے کو فرمائیں فوراً کرو اور جس سے روکیں اس سے رُک جاؤ۔ یعنی ہر عمل اور ارشاد میں آپؐ کی تعمیل ہونی چاہیئے۔ گویا اس آیت میں صحیح اسلامی زندگی گذارنے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ جو کچھ فرماتے ہیں وہ برحق ہے اور اللہ کی ہدایت سے احکام بیان فرماتے ہیں اور خود عمل کرتے ہیں۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (سورہ العنکبوت، ۴۵)

ترجمہ:۔ بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بُری بات سے۔

تشریح:۔ آیت بالا کے اس ٹکڑے نے واضح کیا ہے کہ نماز میں ایسی خوبی ضرور ہے جس کے سبب نمازی بے حیائی اور بُرائی سے بچ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب کسی بیماری کی تشخیص ہو جائے اور اس کے لیے مناسب دوائی بھی تجویز ہو تو دوا ضرور اثر دکھاتی ہے۔ بشرطیکہ بیمار کسی ایسی چیز کا استعمال نہ کرے جو اس دوا کی تاثیر کے خلاف ہو۔ اس اعتبار سے واقعی نماز بھی قوی التاثیر ہے۔ اس کا ایک اور مفہوم یہ بھی ہے کہ نماز کے اندر چند ایسی خوبیاں ہیں جن کی موجودگی میں اس آدمی کے لیے جو واقعی نماز خلوص سے پڑھتا ہو، ممکن نہیں کہ بے حیائی اور بُرائی کی طرف جھکے۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ (سورہ الانعام، ۱۶۵)

ترجمہ:۔ اور جو کوئی گناہ کرتا ہے سو وہ اس کے ذمّہ پر ہے اور بوجھ نہ اٹھائے گا ایک شخص دوسرے کا۔

تشریح:۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ جو شخص

جیسے اعمال کرے گا، اچھے ہوں یا بُرے۔ اس کے مطابق جزا و سزا پائے گا۔ گویا اچھے اعمال کی اچھی جزا اور بُرے اعمال کی بُری سزا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ (سورہ النحل۔ ۹۰)

ترجمہ:۔ بے شک اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا۔

تشریح:۔ آیت کے اس حصّہ میں عدل و احسان کا حکم دیا گیا ہے۔ عدل کے معنی انصاف کے ہیں۔ یعنی کسی کو اس کا پورا حق ادا کرنا، اور احسان یہ ہے کہ کسی سے اس کے حق سے بڑھ کر مروّت اور نیکی کرنا۔ اس آیت میں جہاں لین دین کے معاملے میں انصاف کرنے کا حکم موجود ہے وہاں سب عقائد، اخلاق اور اعمال کے معاملے میں بھی انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔ اس پوری آیت میں تمام بھلائیوں کو جمع کیا گیا ہے۔ اس لیے اس آیت کی جامعیت کے پیشِ نظر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس آیت کو خطبہ جمعہ کے آخر میں شامل کر دیا تھا۔ جو آج تک جمعہ کے روز خطبہ کے آخر میں پڑھا جاتا ہے۔

منتخب احادیث

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى

(بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، اصول کافی بہ الفاظ مختلفہ)

ترجمہ:۔ بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور بے شک انسان وہی کچھ پائے گا جو اس نے نیت کی ہوگی۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ۔ (موطاء امام مالک)

ترجمہ:۔ بے شک مجھے اس خاطر رسول بنا کر بھیجا گیا ہے تاکہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں۔

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ

وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ:۔ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان دار نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اُسے اُس کے والدین اور اولاد اور سب لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ ۔ (بخاری، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، سنن داری، مسند احمد بن حنبل، اصول کافی بالمعنی)

ترجمہ:۔ تم میں سے کوئی ایک اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہ چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، سنن داری، مسند احمد بن حنبل، اصول کافی)

ترجمہ:۔ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔

لَا یَرْحَمُہُ اللّٰہُ مَنْ لَّا یَرْحَمِ النَّاسَ ۔ (مسلم، ترمذی، مسند احمد بن حنبل)

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں فرماتے جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔

کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُہٗ وَمَالُہٗ وَعِرْضُہٗ۔ (ابن ماجہ، مسند احمد بن حنبل)

ترجمہ:۔ ہر مسلمان کا سب کچھ دوسرے مسلمان پر حرام ہے اس کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت۔

مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ ۔ (مسند احمد بن حنبل، اصول کافی بالمعنی)

ترجمہ:۔ جس نے میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہیں ہوگا۔

مَنْ سَلَکَ طَرِیْقًا یَّطْلُبُ فِیْہِ عِلْمًا سَلَکَ اللّٰہُ بِہٖ طَرِیْقًا مِّنْ طُرُقِ الْجَنَّۃِ ۔ (بخاری، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد بن حنبل)

ترجمہ:۔ جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستے پر چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے

راستوں میں سے کسی راستہ پر لے جاتا ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ اَخُو الْمُؤْمِنِ کَالْجَسَدِ الْوَاحِدِ اِنِ اشْتَکٰی شَیْئًا مِنْہُ وَجَدَ اَلَمَ ذٰلِکَ فِیْ سَائِرِ جَسَدِہٖ ۔ (مسلم، ترمذی، مسند احمد بن حنبل، اصول کافی)

ترجمہ:۔ ہر مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے۔ جیسے ایک جسم۔ اگر اس جسم کا کوئی حصہ بھی تکلیف میں مبتلا ہو تو وہ اپنے سارے جسم میں تکلیف محسوس کرے گا۔

سوالات

۱۔ قرآن مجید کے اسما کون کون سے ہیں؟ پہلی وحی کے نزول کا واقعہ تفصیل سے لکھیں۔

۲۔ مکی اور مدنی سورتوں کی خصوصیات تحریر کریں۔

۳۔ حجۃ الوداع کی تفصیل بیان کریں۔

۴۔ مختصر نوٹ لکھیں۔

۱۔ قرآن مجید کی حفاظت (۲) قرآن مجید کی ترتیب

۵۔ مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیں۔

۱۔ عہد صدیقی میں قرآن مجید کی جمع و تدوین۔

۲۔ قرآن مجید کا انداز بیان۔

۳۔ قرآن مجید کی خوبیاں۔

۶۔ حدیث کے معنی بیان کریں۔ حدیث کی اپنی حیثیت کیا ہے؟

۷۔ تدوین حدیث کے تینوں ادوار کا تفصیل ذکر کریں۔

۸۔ صحاح ستہ اور ان کے مصنفین کے نام مع ان کے سن وفات لکھیں۔

۹۔ اصول اربعہ اور ان کے مصنفین کے نام مع ان کے سن وفات لکھیں۔

(سیدنا) نبی کریم ﷺ نے فرمایا

اَنَاخَاتَمُ النَّبِیّنَ لاَ نَبِیَّ بَعْدِیْ

"میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔"

(سنن ترمذی: کتاب الفتن)

(سیّدنا) نبی کریم ﷺ نے فرمایا

کسی نے ہرگز کوئی کھانا اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر نہیں کھایا ہے۔
اللہ تعالیٰ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھایا کرتے تھے۔

(صحیح بخاری)

ایک دوسرے کا مال آپس میں
ناحق نہ کھاؤ۔

(سورۃ البقرہ آیت 188)